زادِ راہ

از

منشی پریم چند

تعداد 1000

قیمت :- سوا آٹھ روپے 8/25





رتن داس بک ڈپو - ہال بازار - امرتسر

۱. وفا کی دیوی ——————
۲. زیور کا ڈبہ ——————
۳. آشیاں برباد ——————
۴. خانہ داماد ——————
۵. قہر خدا کا ——————
۶. فریب ——————
۷. لاٹری ——————
۸. نیور ——————
۹. لعنت ——————
۱۰. بڑے بھائی صاحب ——————
۱۱. مس پدما ——————
۱۲. ہولی کی چھٹی ——————
۱۳. زادِ راہ ——————
۱۴. حقیقت ——————
۱۵. ڈامل کا قیدی ——————

(جمال پریس دہلی)

وفا کی دیوی

(۱)

بڈھوں میں جو ایک طرح کی بے شرمی، قریب قریب خلوص سے ملتی ہوئی پیدا ہو جاتی ہے وہ "تلیا" میں اس وقت تک نہ آئی تھی۔ حالانکہ اس کے سر کے بال چاندی ہو گئے تھے؛ اور گال لٹک کر ڈاڑھوں کے نیچے آ گئے تھے۔ لوگ اس کی عمر کا اندازہ ستر سے اوپر کرتے تھے۔ وہ خود تحقیق کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ لیکن اب بھی وہ کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہتی تھی، چلتی تو ساڑی سے سر ڈھانک کر، آنکھیں نیچی کئے ہوئے۔ گویا نویلی بہو ہے۔ ذات کی چمارن تھی، لیکن کیا مجال کہ کسی غیر کے گھر کا پکوان دیکھ کر اس کا جی للچا جائے۔ گاؤں میں اونچی نیچی ذاتوں کے بہت سے گھر تھے۔ تلیا کی سب جگہ آمد و رفت تھی۔ سارا گاؤں اس کی عزت کرتا تھا اور عورتیں تو

دل سے اس کے ساتھ عقیدت رکھتی تھیں، اسے اصرار کر کے اپنے گھر بلاتیں، اس کے سر میں تیل ڈالتیں، مانگ میں سیندور بھرتیں، کوئی اچھی چیز پکائی ہوتی، جیسے پھلوڑیاں، کھیر یا حلوا، تو اسے کھلانا چاہتیں، لیکن بڑھیا کبھی نہ کھاتی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا، چماروں کے ٹولے میں ایک آدمی بھی نہ تھا، کچھ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، کچھ پلیگ اور ملیریا کی نذر ہو گئے، ان کے ماتم میں تھوڑے سے کھنڈر کھڑے تھے، برہنہ سر، چھاتی ہی پیٹتے ہوئے صرف "تلیا" کی جھونپڑی زندہ تھی اور "تلیا" حالانکہ "تلیا" مسافرت کا وہ حصہ طے کر چکی تھی جہاں انسان تمام ظاہری اور مذہبی قیود سے نجات پا جاتا ہے، اور اب اونچی ذات والوں کو بھی اس کی ذات کی بنا پر اس سے کوئی پرہیز نہ تھا، سب ہی اسے اپنے گھر میں گوشہ دینے کو تیار تھے مگر وضعدار بڑھیا کیوں کسی کا احسان لے، کیوں اپنے شوہر مرحوم کی عزت میں بٹہ لگائے، جس کی اس نے کبھی صورت نہ دیکھی تھی، صرف نام سنا تھا۔ ہاں صرف نام سنا تھا، جب اس کی شادی ہوئی تو اس کی عمر کل پانچ سال کی تھی، اس کا شوہر اٹھارہ سال کا خوش رو گٹھیلا نوجوان، شادی کے بعد وہ پورب کی طرف کمانے چلا گیا، سوچا تھا، ابھی بیوی کے بالغ ہونے میں دس بارہ سال کی دیر ہے، اتنے دنوں کچھ نہ کچھ روپے جمع کر لیں اور پھر ساری زندگی مزے سے گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کریں، لیکن بیوی بالغ بھی ہو گئی، جوان بھی ہو گئی، بوڑھی بھی ہو گئی، وہ لوٹ کر نہ آیا اس کے خطوط ہر تیسرے مہینے آتے تھے اور خط کے ساتھ تیس روپے کا منی آرڈر بھی ہوتا، خط کے لفافے کے اندر جواب کے لئے ایک لفافہ خالی بھی رکھا ہوتا تھا، یہی وہ رشتہ تھا جو ان میاں بیوی کا تعلق قائم رکھے ہوئے تھا، خط میں وہ اپنی مجبوریوں اور بدنصیبی کا اظہار کرتا اور لکھتا، کیا کروں تو لا: دل میں یہی ارمان ہے کہ ایک بار تم سے مل لیتا، اپنی جھونپڑی آباد کر دیتا مگر سب کچھ نصیب کے ہاتھ ہے، اپنا کوئی بس نہیں ہے۔

جب بھگوان لائیں گے تب آؤں گا تم صبر کرنا، میرے جیتے جی تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی، تمہاری بانہہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک اس کا نباہ کروں گا، جب آنکھیں بند ہو جائیں گی تب کیا ہوگا کون جانے" قریب قریب یہی مضمون الفاظ کے خفیف تغیر کے ساتھ ہر ایک خط میں ہوتا اور یہ خط "تلیا" کے حرز جان تھے۔ ایک خط بھی اس نے نہ پھاڑا تھا، ایسے شگون کے خط کہیں پھاڑے جاتے ہیں۔ ان کا ایک چھوٹا سا دفتر جمع ہو گیا۔ بوسیدہ، بے رنگ، سیاہی تک اُڑ گئی تھی۔ کاغذ کا رنگ بھی اُڑ گیا تھا۔ مگر سب کے سب جوں کے توں اس کی پٹاری میں ایک لال ڈورے سے بندھے ہوئے رکھے تھے۔ ان خطوط کو پا کر "تلیا" کو بے اندازہ مسرت ہوتی، اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے۔ بار بار پڑھواتی اور بار بار روتی، اور اس دن سر دھو، سر میں تیل ڈالتی۔ سیندور سے مانگ بھرواتی، رنگین ساڑی پہنتی، اس کا سہاگ جاگ اُٹھتا تھا۔ بہوئیں مذاق سے پوچھتیں، کیوں تو لالہ تم نے پھوپھا کو دیکھا تو ہوگا، ان کی کچھ یاد آتی ہے۔ اور تلیا کے پر شکن چہرے پر جوانی عود کر آتی، آنکھوں میں ایک سرور پیدا ہو جاتا۔ کہتی یاد کیوں نہیں آتی، بیٹا ان کی صورت تو اب بھی میرے سامنے ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں، لال لال، اونچا ماتھا، چوڑی چھاتی، ایسا تو اب یہاں کوئی بیٹھا بھی نہیں ہے۔ موتیوں کے سے دانت تھے بیٹا، لال لال کرتا پہنے ہوئے تھے۔ جب بیاہ ہو گیا تو میں نے ان سے کہا میرے لئے بہت سے گہنے بنواؤ گے نا؟ نہیں تو میں تمہارے گھر نہ آؤں گی۔ لڑکپن تھا بیٹا، سرم لحاظ کچھ تھوڑے ہی تھا۔ وہ میری بات سن کر بڑے زور سے ہنسے اور مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر بولے، میں تجھے گہنوں سے لاد دوں گا، تلیا کتنے گہنے پہنے گی تو، میں پردیس کمانے جاتا ہوں وہاں سے روپے بھیجوں گا، تو بہت سے گہنے بنوانا، اور جب میں آؤں گا تو اپنے ساتھ بہت سے گہنے لاؤں گا، میرا دولہا گیا تھا، بیٹا ملں

باپ کی ایسی حیثیت کہاں تھی، کہ انہیں برات کے ساتھ بلاتے، انہیں کے گھر میرا ان سے بیاہ ہوا، اور ایک دن وہاں رہی، اسی ایک دن میں وہ مجھے کچھ ایسے بھائے کہ جب وہ چلنے لگے، تو ان کے گلے لپٹ کر روتی تھی، اور کہتی تھی، اب مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، میں تمہارا کھانا پکاؤں گی، تمہاری کھاٹ بچھاؤں گی۔ وہاں انہیں کی عمر کے دو تین آدمی اور بیٹھے تھے۔ انہیں کے سامنے وہ مسکرا کر میرے کان میں بولے اور میرے ساتھ سوسے گی نہیں، بس میں اُن کا گلا چھوڑ کر الگ کھڑی ہو گئی اور بولی "گالی دو گے تو کہے دیتی ہوں۔ ہاں"

لاکھوں ہی بار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل چکے تھے، مگر اس کے لئے وہ ہمیشہ تازہ تھے، اس کے جگر کے عزیز ترین گوشے میں محفوظ، جہاں ہوا کا گزر نہ تھا، ان میں وہی لطافت تھی، وہی لذت، وہی خیر یعنی، آہ! اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا، کھلا پڑتا تھا۔ گھونگٹ نکال کر، بھاؤ بنا کر، منہ پھیر کر، اور ایک دل آویز تبسم کے ساتھ دل ہی دل میں اس کا مزہ لیتی ہوئی وہ اس واقعہ کو بیان کرتی، جو اس کی عمر طویل کی بہترین یادگار تھا۔ شبنم میں بھیگے ہوئے پھول کی طرح دل آویز، وہ پھول ابھی تازہ تھا۔ اس میں وہی خوشنمائی تھی، وہی خوشبو، واقعاتی زندگی کی جھلسانے والی آلائشوں سے پاک، تمنا ابھی تک تمنا کی سرخ خوشبو اور کیفیتوں سے مرصع تھی۔ جسے کشاکش حیات نے بے جان نہ کر پایا تھا۔

۲

لیلیا کسی زمانہ میں حسین تھی، کافر ادا تھی، قاتل تھی، اور اپنے کشتگان ناز کی درد بھری داستانیں جب وہ بہ چشم پُرنم کہتی تو شاید کشتوں کی روحیں عالم زیریں یا

عالمِ بالا میں وجد کرتی ہوں گی، زندگی میں جن کی اس نے بات نہ پوچھی انہیں پر ہمدردی اور وفا کے پھول نثار کرتی تھی۔ اس کی اُٹھتی ہوئی جوانی تھی، ماں باپ رخصت ہو گئے تھے۔ بھائی بھی پردیس چلا گیا۔ وہ گھر میں اکیلی رہ گئی، وہ جدھر سے نکل جاتی تھی نوجوان کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ تب نبی سنگھ نام کا ایک ٹھاکر تھا، بڑا چھیلا، بڑا رسیا، دن میں سینکڑوں بار اس کے گھر کا چکر لگاتا۔ تالاب کے کنارے کھیت میں، کھلیان، کنوئیں پر جہاں وہ جاتی، سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا۔ کبھی دودھ لے کر اس کے گھر جاتا، کبھی گھی لے کر، کبھی ساڑیاں لے کر، کہتا تلیا میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا۔ تو میری بھینٹ لے لے تو مجھ سے بولنا نہیں چاہتی مت بول، میری صورت دیکھنا نہیں چاہتی مت دیکھ، لیکن جو کچھ میں لاؤں اسے لے لے۔ تبھی اسی سے میرا دل بھر جائے گا۔ بھولی بھالی تلیا ایسی انیلی نہ تھی جانتی تھی یہ انگلی پکڑنے کی باتیں ہیں، انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے کی باتیں ہونے لگیں گی۔ لیکن نہ جانے کیسے وہ اس کے دھوکے میں آ گئی، نہیں دھوکے میں نہیں آئی اسے اس کی جوانی پر ترس آیا۔ ایک دن وہ پکے ہوئے قلمی آم لایا۔ تلیا نے اپنی زندگی میں قلمی آم نہ کھائے تھے۔ آم اس سے لے لئے، پھر تو روزانہ آم کے ٹوکرے آنے لگے اور آم لے کر نبی سنگھ خود آتا اور چھپ کر رات کو آتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے گاؤں میں شور مچ جائے گا۔ ایک دن جب تلیا آم کی ٹوکری لے کر گھر میں جانے لگی تو نبی سنگھ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور جھٹ اس کے پیروں پر گر پڑا اور بولا۔ تلیا اگر اب بھی تجھے مجھ پر دیا نہیں آتی تو آخر تجھے مار ڈال اپنے ہاتھوں سے مار ڈال لیں جب ہی اپلا کھائے ہے۔ تلیا نے آم کی ٹوکری پٹک دی اور اپنے پاؤں چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس کی طرف غصے کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ اچھا ٹھاکر اب یہاں سے چلے جاؤ۔ نہیں تو یا تم نہ رہو گے یا میں

نہ رہوں گی۔ تمہارے آموں میں آگ لگے۔ اور تم کو کیا کہوں۔ میرا آدمی کالے کوسوں میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے، اسی لئے کہ میں یہاں اس کے نام کو کلنک لگاؤں؟ وہ مرد ہے چار پیسہ کماتا ہے۔ کیا وہ دوسری نہ رکھ سکتا تھا۔ عورتوں کی سنسار میں کمی ہے، لیکن وہ میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے۔ مرد ہو کر بیٹھا ہوا ہے۔ تم سے کم پڑھا نہیں ہے۔ تمہارے جیسا سندر چاہے نہ ہو، پڑھو گے اس کی چٹھیاں وہ جو میرے نام پر بھیجتا ہے۔ آپ چاہے جس حال میں ہو، میں کون یہاں بیٹھی دیکھتی ہوں، لیکن ہر تیسرے مہینے میرے لئے روپے بھیج دیتا ہے۔ اسی لئے کہ میں دوسروں سے یہاں پیار کروں؟ وہ ایک پیسہ بھی نہ بھیجے، لیکن جب تک وہ ایسی پریم سے بھری چٹھیاں بھیجتا رہے گا، جب تک وہ مجھ کو اپنی اور اپنے کو میرا سمجھتا رہے گا۔ تلیا اس کی رہے گی۔ دل میں بھی، دکھاوے میں بھی، جب اس سے میرا بیاہ ہوا ہے، تب میں پانچ برس کی الھڑ چھوکری تھی، تمہارے دروازے پر جاتی تھی تم دتکار دیتے تھے۔ اس نے میرے ساتھ کیا سکھ اٹھایا، جو میرے لئے اتنا کر رہا ہے۔ بس ایک باہنہ پکڑنے کی لاج کو نبھا رہا ہے، تو میں عورت ہو کر اس کے ساتھ دغا کروں۔

یہ کہہ کر وہ اندر گئی اور چٹھیوں کی پٹاری لا کر ٹھاکر کے سامنے پٹک دی، مگر ٹھاکر کو چٹھیوں کے پڑھنے کا ہوش کہاں تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ ہونٹ پچکے جا رہے تھے، چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا، مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا، تولا! میں نے تم کو پہچانا نہ تھا۔ اب اس کی سزا یہی ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو۔ اسی وقت مار ڈالو، ایسے روسیاہ آدمی کا زندہ رہنا کس کام کا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ بس اب یہی آرزو ہے کہ تمہارے

ہاتھوں قتل ہو جاؤں۔

تلیا کو اس پر رحم نہیں آیا، وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ ابھی تک شرارت کئے جاتا ہے۔ جھلا کر بولی، مرنے کو جی چاہتا ہے تو مر جاؤ، کیا دنیا میں کنوئیں تالاب نہیں یا تمہارے پاس تلوار کٹار نہیں ہے۔ میں کسی کو کیوں ماروں۔

ٹھاکر نے مایوس نظروں سے دیکھا۔ "تو تمہارا یہی حکم ہے؟"

میرا حکم کیوں ہونے لگا۔ مرنے والے کسی سے حکم نہیں لیتے۔

وہ چلا گیا اور دوسرے دن ندی میں اس کی لاش تیرتی ہوئی ملی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے ڈوب گیا۔ یہی خیال آیا ہو گا۔ پاؤں پھسل گیا ہو گا، کئی دن تک کیا کئی مہینوں تک گاؤں میں اس کا چرچا رہا۔ تلیا نے زبان تک نہ کھولی، ٹھاکر کے مرتے ہی بھائی نے جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اس کی بیوی اور بچے کو ستانے لگا، دیورانی طعنے دیتی، دیور عیوب لگاتا آخر غریب بیوہ ایک دن زندگی سے تنگ آکر بچے کو لے کر گھر سے نکل پڑی۔ رات کا وقت تھا تلیا اپنے دروازہ پر کھڑی تھی، لالٹین جل رہی تھی اور پانی کے دن تھے۔ سہ ماہی تیس روپے میں اس بڑی فراغت سے گذارن ہوتی تھی، جو وہ کھاتی اور پہنتی تھی وہ ٹھکرانیوں کو بھی نصیب نہ تھا، گائے پالی تھی۔ اسی کو روٹی کھلانے نکلی تھی کہ اس نے ٹھکرائن کو بچے کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ٹھکرائن سسکتی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ تین سال کا بچہ گود میں تھا۔

تلیا نے پوچھا، اس وقت کہاں جاتی ہو ٹھکرائن، سنو، ہنوہ کھیا رات ہے تم تو رو رہی ہو۔

ٹھکرائن جا رہی تھی مگر کہاں، یہ اسے خود معلوم نہ تھا، وہ یہاں رہنا نہ چاہتی تھی، اور اپنے بچے کی جان کا خوف تھا۔ ان دنوں یہ پولیس کی تحقیقاتیں کہاں تھیں، دیور اسے اور اس کے بچے کو مار ڈالتا، کسی کو خبر بھی نہ ہوتی، مگر اس جمار دن

سے اپنا دُکھڑا کیسے کہے۔ آخر تھی ٹھکرائن۔ ایک بار تلیا کی طرف دیکھا اور بلا کچھ جواب دیئے آگے بڑھی۔ جواب کیسے دیتی گلے میں تو آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ اس وقت نہ جانے کیوں اور زیادہ اُمڈ آئے تھے۔

تلیا نے گاٹے کے سامنے روٹی پھینکی، لوٹے سے ہاتھ دھویا، اور قریب آکر بولی جب تک مجھے نہ بتاؤ گی کہاں جا رہی ہو، میں تمہیں آگے ایک قدم نہ جانے دوں گی۔"

ٹھکرائن رک گئی۔ اور آنسو بھری آنکھوں میں غصہ بھر کر بولی۔ "تو مجھے کیا کرے گی پوچھ کر تجھ سے مطلب؟

"تجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں، میں تمہارے گاؤں میں نہیں رہتی؟ گاؤں والے ایک دوسرے کے دکھ درد میں نہ ساتھ دیں گے تو کون دے گا۔"

"اس زمانہ میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے، تلیا جب اپنے گھر والوں نے ساتھ نہ دیا اور تیرے بھیا کے مرتے ہی میرے خون کے پیاسے ہو گئے تو پھر میں کس سے اُمید رکھوں کیا تو میرے گھر کا حال نہیں جانتی، تجھ سے کیا چھپا ہے، وہاں تائن، کہارن کے لئے روٹیاں ہیں اور میرے لئے نہیں ہیں، اور لاتوں کی ماری روٹیاں کون کھائے۔ میں کسی سے خیرات نہیں مانگتی اپنا حق مانگتی ہوں، میں رکھیلی نہیں ہوں "اڑھری" نہیں ہوں، بیاہتا ہوں، دس گاؤں کے آدمیوں کے بیچ میں بیاہ کے آئی ہوں، اپنا رتی بھر حق نہ چھوڑوں گی۔ آج کوئی نہ دے، میں اناتھ ہوں، لیکن چاہے میری آبرو جائے، ان کو ملا کے چھوڑوں گی، اور اپنا حصہ لے کر رہوں گی۔

"تیرے بھیا" یہ دو لفظ تلیا کو اتنے پیارے لگے کہ اس نے ٹھکرائن کو گلے سے لگا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی، "تو بہن میرے گھر میں چل کر رہو کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے، تلیا مرتے دم تک تمہارا ساتھ دے گی، میرا گھر تمہارے رہنے کے

وثیق نہیں ہے، میں بھی غریب ہوں، لیکن گھر میں چاہے اور کچھ نہ ہو شانتی تو ہے،
اور میں کتنی ہی غریب ہوں لیکن تمہاری بہن تو ہوں۔
ٹھکرائن نے اس کے چہرے کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا ایسا
نہ ہو میرے پیچھے میرا دیور تمہارا دشمن ہو جائے۔
تلیا نے دلیرانہ انداز سے کہا میں دشمنوں سے نہیں ڈرتی اور پران
سے پہلے ہی کون جاتا ہے، اور تم پردہ میں رہتی ہی ہو۔
ٹھکرائن تلیا کے ساتھ اس کے گھر میں آکر بیٹھ گئی، وہاں ایک ہی
کھاٹ تھی، تلیا نے اس پر بچے کو لٹا دیا، چمارن کے برتن میں ٹھکرائن کیسے کھانا پکائے
کیسے پانی پئے تلیا دوسرے ہی دن بازار سے برتن بھانڈے لائی اور ٹھکرائن کیلئے
ایک کوٹھڑی الگ کر دی، ٹھکرائن مغرور تھی، آرام پسند تھی، مگر دھن کی پوری تلیا
اس کے برتن دھوتی، اس کے کپڑے صاف کرتی، اس کا بچہ کھلاتی۔ ٹھکرائن اس طرح
کام لیتی تھی گویا وہ اس کی لونڈی ہے، لیکن تلیا کشتۂ ناز عاشق کے ساتھ وفا کا
نباہ کر رہی تھی، اس کا من کبھی نہ میلا ہوتا۔ ماتھے پر کبھی نہ بل پڑتا۔
ایک دن ٹھکرائن نے کہا۔ تو لالہ تم بچے کو دیکھتی رہنا، میں چار
دن کے لئے ذرا باہر جاؤں گی، اس طرح تو یہاں رہنا زندگی بھر پڑی رہوں گی، مگر
مگر دل کی آگ نہ ٹھنڈی ہو گی۔ اس بے حیا کو اس کی شرم کہاں کہ بھاوج کسی غیر کے
ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہے، وہ تو اسی کوشش میں ہے، کہ کسی طرح مجھے یہاں
سے نکلوا دے اور ممکن ہو تو بدنام کرے اتنے دن تو آرام کر چکی، اب کچھ کام
بھی کرنا چاہیئے۔
تلیا نے پوچھا، کہاں جانا چاہتی ہو بہن۔ کوئی ہرج نہ ہو تو میں بھی
ساتھ چلوں اکیلی کہاں جاؤ گی۔

"اس سانپ کو کچلنے کے لئے کسی کی مدد کے بغیر کام نہ چلے گا۔"

"وہ مدد کہاں ملے گی؟"

"میں جانتی ہوں، اور پھر تجھ سے کیا چھپاؤں۔ میں اپنے روپ کے جادو سے ان کا گھمنڈ توڑ دوں گی، میرے پاس دوسرا کون ہتھیار ہے۔ میں جوان ہوں اور ایسی بُری بھی نہیں ہوں۔ میں آج اپنا روپ بیچنے پر آجاؤں تو جانتی ہوں اس کے دام کیا ہوں گے، اس بھیڑیے کا سر، اور میں نے یہی طے کیا ہے، اس پرگنہ کا حاکم جو کوئی بھی ہو اسی پر میرا جادو چلے گا۔ اور ایسا کوئی مرد نہیں ہے جو کسی خوبصورت عورت کے جادو سے بچ سکے، چاہے وہ اسی سال کا بڈھا ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے وہ رشی ہی کیوں نہ ہو، دھرم جاتا ہے جائے، مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتی کہ میں بن بن کی پتیاں توڑوں اور وہ تھیلا مونچھوں پر تاؤ دے کر راج کرے، اور یہ کل تین چار دن کا کام ہے۔ تلیا کل تین چار دن کا کام۔ تو بچے کی دیکھ بھال کرنا۔ بچہ تجھ سے ہلا ہوا ہی ہے میرے لئے بہت نہ ہراگے گا۔ کوئی پوچھے کہاں گئی، تو کہہ دینا میکے چلی گئی۔"

تلیا کو معلوم ہوا۔ اس خود دار عورت کے دل پر کتنی گہری چوٹ ہے، اس جلن کو مٹانے کے لئے وہ جان ہی پر کھیل رہی ہے، دھرم پر کھیل رہی ہے، جسے وہ جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے۔ بھیسی سنگھ کی وہ صورت اُنجا اس کی نظروں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ طاقتور تھا، اپنے فولادی قوٰی سے وہ بڑی آسانی سے اس پر جبر کرسکتا تھا اور اس رات کے سناٹے میں اس کی حمایت کرنے والا کون تھا مگر اس کی اس عفت آمیز تنبیہ نے بھیسی سنگھ کو کس طرح رام کرلیا۔ گویا کوئی خونخوار اژدہا سُریلا راگ سُن کر مست ہوگیا اور اپنا خونی ارادہ ترک کرکے اس کی تانوں پر ناچنے لگے، اسی سچے ستونتا کی آبرو آج خطرہ میں ہے، کیا تلیا اس آبرو کو لٹنے دے گی

اور خاموش بیٹھی رہے گی۔ نہیں، نہیں، نہیں۔

عیسیٰ سنگھ کا وہ سرفروشانہ ضبط، وہ مردانہ تحمل، وہ بندوق شہادت، وہ سچا عشق وہ اپنی شمع حیات کو بجھا کر سوزِ نہاں کو ٹھنڈا کرنے کا تحمل، وہ اس کے فیصلہ پر جان نثار کر دینے کا جذبۂ بے نیازہ، نہیں عیسیٰ سنگھ نے اس کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا، تو وہ بھی اس کی آبرو کو اپنی آرزو سے زیادہ عزیز ثابت کر دے گی۔ اپنی سحر طرازیوں سے اپنی محبت نوازیوں سے، اپنی شیریں اداؤں سے۔ اپنی عصمت کو گوشۂ جگر میں محفوظ رکھے ہوئے، وہ اپنی وفا کا حق ادا کرے گی۔

تلیا نے ٹھکرائن کو تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ابھی تم مت جاؤ۔ بہن ہنس مت جاؤ۔ پہلے مجھے اپنی طاقت آزما لینے دو میری آبرو چلی بھی گئی تو کون ہنسے گا۔ تمہاری آبرو کے پیچھے ایک خاندان کی آبرو ہے۔

ٹھکرائن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اور مسکرائی۔ اس نے کہا۔ تو یہ فن کیا جانے تلیا!

"کون سا فن؟"

"یہی مردوں کو اُلّو بنانے کا۔"

"یہ فن سبھی عورتوں کو آتا ہے، بہن کہیں سیکھنے جانے کا کام نہیں۔"

"اچھا تو بتاؤ کیا کرو گی؟"

"وہی جو تم کرنے جا رہی ہو۔ تم حاکم پرگنہ پر اپنا جادو ڈالنا چاہتی ہو میں تمہارے دیور پر جادو ڈالوں گی۔"

"بڑا گھاگھ ہے۔"

"گھاگھوں کو پھانسنا اور بھی زیادہ آسان ہے۔"

(۳)

تلیا نے آزمودہ کار جنرل کی طرح جارحانہ عمل یا مدافعت اور مراجعت کے نقشے تیار کئے اور تسخیر کی تیاریاں کرنے لگی عمل کے مدارج اور کامیابی کی منزل جتنی صفائی سے اسے نظر آتی تھی، شاید سکندر یا نپولین کو بھی نظر نہ آئی ہوگی۔ پیش بندی کے لئے اس نے مدافعت اور مراجعت کے پہلو بھی سوچ لئے۔ مگر اسے اس میں شک نہ تھا کہ یہ "بڑھے چلو" والی جنگ ہوگی۔ غنیم بالکل بے خبر تھے؛ بالکل غیر مسلح اور اس فن حرب سے بالکل غیر معروف۔

بنتی سنگھ کا چھوٹا بھائی گردھر کندھے پر چھ فٹ کا موٹا ڈنڈا رکھے اکڑتا ہوا چلا آتا تھا کہ تلیا نے پکارا، ٹھاکر جو! یہ گھاس کا گٹھا اٹھا کر میرے سر پر رکھ دو مجھ سے نہیں اُٹھتا۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ کسان اپنے اپنے کھیتوں سے لوٹ کر گھر آ چکے تھے۔ راستے میں سناٹا تھا۔ اس وقت تلیا کا آنچل کھسک گیا، اور سرخ چولی سے اندر کا ابھار جھلک پڑا! تلیا نے جھٹ آنچل سنبھال لیا، مگر اس کوشش میں اس کا سر کھل گیا اور اس کے جوڑے میں گتھی ہوئی پھولوں کی بینی بجلی کی طرح آنکھوں میں کوند گئی گردھر پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی اعلیٰ اور ادنیٰ امتیاز مٹ گیا۔ آنکھوں میں ہلکا سا نشہ نمودار ہوا اور چہرے پہ ہلکی سی سرخی اور خفیف سا تبسم، رگ رگ میں نغمہ سا گونج گیا۔

اس نے تلیا کو ہزاروں بار دیکھا تھا۔ آرزو اور التجا کی آنکھوں سے، مگر تلیا اپنے حسن اور عصمت کے غرور میں اس کی طرف کبھی مخاطب نہ ہوئی تھی۔ اس کے انداز و بشرے میں کچھ ایسی بے نیازی، کچھ ایسی سرد مہری تھی کہ ٹھاکر کے سارے

حوصلے پست ہو جاتے تھے، سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ آسمان پر اڑنے والے طائر پر اس کے لاسے اور دانے اور جال کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ مگر آج وہ طائر اس کے مکان کے سامنے والی شاخ پر آبیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوکا ہے؛ پھر کیوں نہ وہ دانہ اور جال لے کر دوڑے۔

اس نے مخمور ہو کر کہا "میں پہنچائے دیتا ہوں۔" تلیا تو کیسے سر پر اٹھائے"
تلیا نے شکار پر وار کیا۔ "اور کوئی دیکھ لے تو یہی کہے کہ ٹھاکر پاگل ہو گیا ہے۔"

"مجھے کتوں کے بھونکنے کی پرواہ نہیں۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔"

ٹھاکر نے نہ مانا۔ گٹھا سر پر رکھ لیا اور اس طرح چلا گویا کونین کا خزانہ لئے جاتا ہو۔

(۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ تلیا ٹھاکر پر موہنی ڈال رہی تھی، اور اب اسے مچھلی کی طرح کھلا رہی تھی، کبھی ڈھیلی کر دیتی۔ کبھی کھینچ لیتی۔ لگاوٹ بازی بھی تھی اور پرہیز بھی اور ٹھاکر کی آتش شوق تیز، تیز ہوتی جاتی تھی، اپنا ایمان اور دھرم سب کچھ فنا کر کے بھی وہ حصول مدعا کے قریب نہ آیا تھا۔ تلیا آج بھی اس سے اتنی دور تھی جتنی پہلے۔

ایک دن وہ تلیا سے بولا۔ اس طرح کب تک جلائے گی تلیا، چل کہیں بھاگ چلیں۔

تلیا نے پھندے کو اور کسا۔ "ہاں اور کیا۔ جب تم منہ پھیر لو تو کہیں کام کی رہوں دین سے بھی جاؤں دنیا سے بھی۔"

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا: اب بھی تجھے مجھ پر وشواس نہیں آیا؟

"بھونرے پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں۔"

"اور پتنگے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔"

"بتاؤں کیسے؟"

"میں نے تیرا کوئی حکم ٹالا ہے؟"

"تم سمجھتے ہو گے تلیا کو ایک رنگین ساڑی اور دو ایک گہنے دے کر پھنسا لوں گا، میں ایسی انیلی نہیں ہوں۔"

تلیا نے ٹھاکر کے دل کی بات بھانپ لی تھی۔ ٹھاکر حیرت میں آ کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

تلیا نے پھر کہا: آدمی اپنا گھر چھوڑتا ہے تو پہلے کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا کر لیتا ہے۔ ٹھاکر نے خوش ہو کر کہا: تو چل میرے گھر میں مالکن بن کر رہ۔

تلیا آنکھیں چمکا کر بولی: آج مالکن بن کر رہوں، اور کل لونڈی بن کر بھی رہنے نہ پاؤں، کیوں؟

"تو جیسے کہو، تیرا من بھرے وہ کر، میں تیرا غلام ہوں۔"

"وچن دیتے ہو؟"

"ہاں دیتا ہوں۔"

"پھر تو نہ ٹلو گے؟"

"وچن دے کر ٹل جانا نامردوں کا کام ہے۔"

"تو اپنی آدھی جائیداد میرے نام لکھ دو۔"

ٹھاکر اپنے گاؤں میں ایک کوٹھی، دس پانچ بیگھے کھیت، گہنے کپڑے اور اپنی عزت بھی اس کے قدموں پر نثار کرنے کو تیار تھا۔ لیکن آدھی جائیداد اس کے نام

منتقل کرنے کی ہمت اس میں نہ تھی، کل کو تلیا اس سے کسی بات پر ناراض ہو جائے تو اسے آدھی جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے عورت کا کیا اعتبار۔ اسے یہ گمان تک نہ تھا کہ تلیا اس سے اتنا سنگین فیصلہ کرے گی۔ اسے تلیا پر غصہ آیا، یہ چار دن ملاقات ذرا منہ کیا ہو گئی ہے کہ سمجھتی ہے کہ میں البیرا ہوں، اس کی محبت ایک بے تاب خواہش تھی، لعد لیں" وہ محبت جو اپنے کو فنا کر دیتی ہے اور فنا ہو جانا ہی زندگی کا حال سمجھتی ہے، اس میں نہ تھی۔

اس نے چیں بہ چیں ہو کر کہا "میں جانتا تھا کہ تجھے میری زمین جائیداد ہی سے محبت ہے تلیا مجھ سے نہیں۔"

تلیا نے برجستہ جواب دیا "تو کیا میں نہ جانتی تھی کہ تمہیں میرے روپ اور جوانی ہی سے محبت ہے مجھ سے نہیں۔"

"تو محبت کسے بازار کا سودا سمجھتی ہے؟"

"ہاں سمجھتی ہوں، تمہارے لئے محبت چار دن کا تماشا ہو گی، میں تو کہیں کی نہ رہوں گی جب اپنا سب کچھ تمہیں دے رہی ہوں تو اس کے بدلے میں سب کچھ لینا چاہتی ہوں تمہیں اگر مجھ سے محبت ہوتی تو آدھی کیا ساری جائیداد میرے نام لکھ دیتے لیکن تمہاری نیت معلوم ہو گئی، ہاں بھگوان نہ کرے کہ ایسا کوئی سمے آئے۔ لیکن دن کسی کے برابر نہیں جاتے۔ اگر کوئی سمے آیا کہ تمہارے پاس کچھ نہ رہا تو تلیا دکھا دے گی کہ عورت کیا کچھ کر سکتی ہے۔"

تلیا جھلائی ہوئی وہاں سے چلی گئی، مگر مایوس نہ تھی، نہ بے دل، آگے کیا ہونے والا ہے اس کے متعلق اسے مطلق شبہ نہ تھا۔

ٹھاکر نے جائیداد تو اپنی دانست میں بچا لی تھی، مگر بڑے مہنگے داموں اس کا اطمینان قلب رخصت ہو چکا تھا زندگی میں جیسے کوئی لطف ہی نہ رہ گیا تھا۔ جائیداد آنکھوں کے سامنے تھی، تلیا دل کے اندر، روز سامنے آ کر مسکرانے والی تلیا،

اب آرزو تھی جو حقیقت سے کہیں زیادہ دلآویز ہے، نشہ خیز ہے۔

تلیا اسے کبھی کبھی خواب کی ایک جھلک کی طرح نظر آجاتی اور خواب ہی کی طرح غائب ہو جاتی، گردھر اس سے اپنا دردِ دل کہنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا، لیکن تلیا اس کے سایہ سے بھی پرہیز کرتی، گردھر کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کے لئے اس کی زمین کے مقابلہ میں تلیا کہیں زیادہ اہم ہے۔ اسے اپنی تنگ ظرفی پر غصہ آتا، زمین اور جائیداد کیا تلیا کے نام رہی کیا اس کے نام۔ اس ذرا سی بات میں کیا رکھا ہے، تلیا تو اس وقت کے لئے پیش بندی کر رہی تھی، جب میں اس کے ساتھ بے وفائی کرتا، جب میں اس کا بے کوڑی غلام ہوں تب بے وفائی کیسی، میں اس کے ساتھ بیوفائی کروں گا، جس کی ایک نگاہ کرم کے لئے ترستا رہتا ہوں، کاش وہ ایک بار مل جاتی تو اس سے کہہ دیتا تو اے میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔ کہو نام لکھ دوں، کہو بعنامہ لکھ دوں، مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اس کے لئے نادم ہوں۔ جائیداد سے انسان کو جو ایک رواجی الفت ہے اسی کے زیر اثر میں نے وہ حماقت کی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں وہی چیز سب سے بیش قیمت ہے۔ جس سے زندگی میں کیف اور سرور پیدا ہو۔ اگر فقر اور بے نوائی میں سرور حاصل ہو تو وہی سب سے بیش قیمت ہے جس پر زمین اور ملکیت سب کچھ قربان کر دی جاتی ہے۔ آج بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو دنیا کی نعمتوں پر لات مار کر جنگل بیابان کی سیر کرنے میں مست ہیں۔ اور اس وقت میں اتنی ذرا سی بات نہ سمجھا ہائے رے میری کمبختی۔

۵

ایک دن ٹھاکر کے پاس تلیا نے پیغام بھیجا۔ میں بیمار ہوں، آکر مجھے دیکھ جاؤ کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔

رات کے دس بجے ہوں گے۔ جٹا کر نے سُنا، اور وہ ڈرا، اسکی چھاتی دھڑک رہی تھی اور سر اُڑا جاتا تھا۔ تلیا بیمار ہے۔ تلیا اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ لیکن دل میں بسی ہوئی اور دل و جان سے بھی زیادہ عزیز، دل تو محض اس کا مکان تھا، اور وہ تلیا بیمار ہے کیا ہوگا بھگوان! تم مجھے کیوں نہیں بیمار کر لیتے۔ میں تو اس کی جگہ مرنے کو تیار ہوں۔ تلیا کی بیماری اس کے ذہن میں ہر لمحہ خوفناک ہو جاتی تھی، اور بیماری میں تلیا نے مجھے بلایا ہے۔ کہا ہے کہ آ کر دیکھ جاؤ، کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔ تو اگر نہ بچے گی تلیا میں بھی نہ بچوں گا دیوار سے سر پھوڑ کر جان دے دوں گا، پھر میری اور تیری چتا ایک ساتھ بنے گی، ایک ساتھ دونوں کے جنازے نکلیں گے۔

اس نے قدم اور تیز کیا اور تھر تھراتے ہوئے پاؤں سے تلیا کے گھر میں قدم رکھا تلیا اپنی کھاٹ پر ایک چادر اوڑھے سمٹی پڑی تھی اور اس نیم تاریکی میں جاں بلب معلوم ہو رہی تھی گردھر نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کانپتی ہوئی، اشک میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا تلیا۔ بد نصیب تمہارے قدموں پہ پڑا ہوا ہے۔

تلیا نے آنکھیں کھولیں اور خفیف آواز سے بولی۔ تم ہو۔ گردھر سنگھ تم آ گئے، اب میں آرام سے مروں گی۔ تمہیں ایک بار دیکھنے کے لئے جی بہت بے چین تھا۔ میرا کہا ماپھ کر دینا اور میرے لئے رونا مت۔ اس مٹی کی دیہہ میں کیا رکھا ہے گردھر، یہ تو مٹی میں مل جائے گا۔ لیکن میں کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پرچھائیں کی طرح سدا تمہارے ساتھ رہوں گی تم مجھے نہ دیکھ سکو گے، میری باتیں سُن نہیں سکو گے۔ لیکن تلیا آٹھوں پہر، سوتے جاگتے تمہارے ساتھ رہے گی۔ میرے لئے اپنے آپ کو بدنام مت کرنا۔ گردھر کبھی کسی کے سامنے میرا نام جبان پر مت لانا۔

گردھر زار و قطار رو رہا تھا۔ ہاتھ میں کٹار ہوتی تو اسی وقت جگر میں مار لیتا اور اس کے سامنے تڑپ کر مر جاتا۔

تلیا نے ذرا دم سے کر پھر کہا۔ میں بچوں گی نہیں گردھر تم سے ایک
بنتی کرتی ہوں مانو گے۔
گردھر نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔ اب جیوں گا تو اس لئے کہ تیرا حکم پورا
کروں نہیں تو اس زندگی میں کیا رکھا ہے۔
اسے ایسا معلوم ہوا کہ تلیا مسکرائی۔
"نہیں نہیں ایسا مت کہو تمہارے بال بچے ہیں، ان کی پرورش کرنا اور
مجھے بھول جانا۔ میری یہی منتی ہے کہ اپنی بھابی کو اور اس کے بچے کو اسی طرح رکھنا جیسے
وہ جینی سنگھ کے سامنے رہتی تھیں ان کا آدھا حصہ انہیں دے دینا۔
گردھر بولا۔ لیکن بھاوج تو دو مہینے سے اپنے میکے میں ہیں اور
کہہ گئی ہیں کہ اب کبھی نہ آؤں گی۔
یہ تم نے برا کیا ہے، گردھر بہت برا۔ اب میں سمجھی کہ کیوں
مجھے بڑے بڑے سپنے آ رہے تھے۔ اگر چاہتے ہو کہ میں جی اٹھوں تو جلدی
لکھا پڑھی کر کے کاغذ میرے پاس رکھ دو۔ تمہاری بے انصافی ہی میری
جان کی گاہک ہو رہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری بھاوج کیوں
بار بار مجھے سپنے میں دکھائی دیتی تھی اور جینی سنگھ کیوں مجھ سے سپنے میں
کہتے تھے۔ گردھر نے میری گت بگاڑ دی۔ بس ابھی جاؤ گردھر اور لکھا پڑھی
کر کے کاغذ لاؤ۔ دیر کی تو مجھے جیتا نہ پاؤ گے۔
گردھر نے دبی زبان سے کہا۔ لیکن رات کو کیسے لکھا پڑھی ہوگی،
اسٹامپ کہاں ملے گا۔ لکھے گا کون۔ گواہ کہاں ہیں بتلاؤ۔
"کل سانجھ تک یہ کام کر دوگے۔ تو میں بچ جاؤں گی گردھر جینی
سنگھ مجھے لگے ہوئے ہیں۔ وہی مجھے ستا رہے ہیں، وہی میری جان لے رہے

میں،

"اگر تم نے دیر کی تو تلیا مر جائے گی۔"

"میں کل سانجھ تک آجاؤں گا۔ تلیا تیرا حکم سر اور آنکھوں پر۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تو........

"نہیں نہیں میں کل سانجھ تک نہیں مرونگی، اس کا وشواس رکھو۔"

گردھر اسی وقت وہاں سے نکلا۔ راتوں رات پچیس کوس کی منزل طے کر کے شہر پہنچا، وکیلوں سے مشورہ کیا، اسٹامپ لیا۔ سجان سنگھ کے نام آدھی جائیداد منتقل کرائی، اور چراغ جلتے جلتے حیران و پریشان، تھکن سے چور، اُمید و بیم سے معمور آکر تلیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

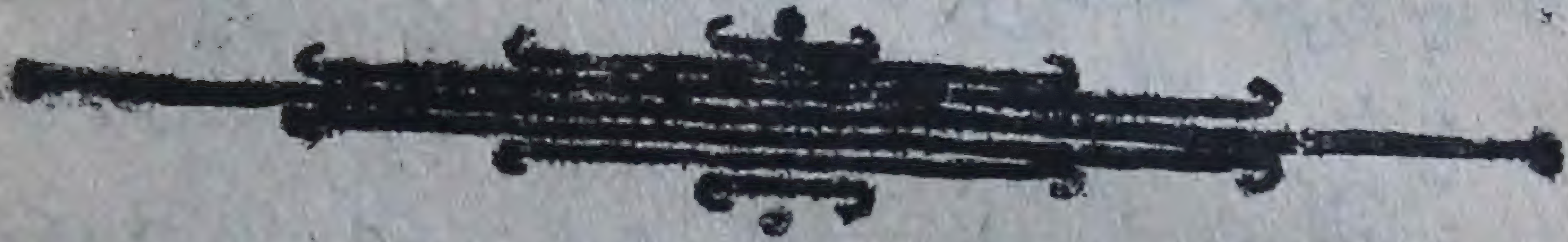
تلیا نے روحانی شگفتگی کے عالم میں کہا، تم آگئے گردھر سلام کر آئے۔

گردھر نے کاغذ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ ہاں تلیا کر آیا، اور اگر اب بھی تم اچھی نہ ہوئیں تو تمہارے ساتھ گردھر کی بھی جان جائے گی۔

تلیا اٹھ بیٹھی اور کاغذ کو اپنے سرہانے رکھ کر بولی۔ میں بہت اچھی ہوں گردھر، تم جب رات یہاں سے چلے گئے۔ تب ہی سے میری طبیعت سنبھلنے لگی، اور اب میں اچھی ہوں، سویرے تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔ لیکن ابھی ابھی میں سو گئی تھی اور شبھی سنگھ مجھے سپنے میں کہہ رہے تھے، تلیا تو بیاہتا ہے۔ تیرا آدمی سجان گھر پر بیٹھا تیرے نام کی مالا جپ رہا ہے، چاہتا تو دوسری کر

لیتا، لیکن تیرے نام پر بیٹھا ہوا ہے اور جنم بھر بیٹھا رہے گا۔ اگر تو نے اُس سے دغا کی تو میں تیرا دشمن ہو جاؤں گا۔ تو نے اپنے آدمی کے ساتھ کپٹ کیا اسی دن میں تیری جان لے لوں گا۔ بس یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔

گردھر نے ایک لمحہ تلیا کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اس وقت ایک روحانی جلال سا چمک رہا تھا۔ اور دفعتاً جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ اور ساری سازش سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سچی عقیدت سے تلیا کے قدموں کو بوسہ دیا اور بولا۔ سمجھ گیا تلیا تو دیوی ہے۔



زیور کا ڈبہ

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے، اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گذر اوقات کے لئے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی الٹا بہو کا بوجھ اور سر پر لاد دیا اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، خوش تمیز، زبان کی طرار، جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مر جانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو ٹیوشن کی نوکری کرتے شرم آتی تھی، لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کیلئے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیئے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا

ہوا تھا، پختہ، ہوادار، صاف ستھرا، اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان جس میں دس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا، کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو ٹھیک انہیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور۔ ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے گویا ملازم نہیں، گھر کا آدمی تھا، اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(۲)

شام کا وقت تھا، پرکاش نے اپنے شاگرد ویرانند کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا، ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ تم سے کچھ کہنا ہے۔

پرکاش نے دل میں سوچا، وہ کیا بات ہے جو ویرانند کے سامنے نہیں کہی جا سکتی۔ پرکاش کو بیٹھک سے جا کر ماں جی نے کہا، تمہاری کیا صلاح ہے، ویرا کا بیاہ کر دوں؟ ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔

پرکاش نے مسکرا کر کہا، یہ تو ویرانند بابو ہی سے پوچھیے۔

"نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا، میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔

"تو ابھی نہ کروں، تمہاری یہی صلاح ہے؟"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔ میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا

پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"میرے رہتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں حاضر ہی ہوں گا کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

بدلی کی فیرر جناتے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے، جو انہیں تیخ بھاجی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا ہے۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے کہیں محلہ کا بنیا گھیرے ہوئے ہے، کہیں گیس اور شامیانے والا خوشامد کر رہا ہے وہ چاہتا تو دو چار سو روپے آسانی سے اڑا سکتا تھا، لیکن اتنا کمینہ نہ تھا، پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیورات خریدے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں، اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں، ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لئے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں، سچ کہتا ہوں، بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں

ٹھہرتی تھی۔

چمپا حاسدانہ لہجہ میں بولی۔ اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ جنہیں ایشور نے دیا ہے وہ ہمیں یہاں تو رو رو کر مرنے کو پیدا ہوتے ہیں۔

چندر پرکاش۔ یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کمانا نہ دھمانا باپ دادا چھوڑ گئے ہیں مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔ اسی لئے کہتا ہوں۔ ایشور بڑا غیر منصف ہے۔

چمپا۔ اپنا اپنا مقدر ہے۔ ایشور کا کیا قصور۔ تمہارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روز مرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے؟ کوئی ڈھنگ کی ساڑی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ ہوتی تو جان بچتی۔

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں پرکاش نے تسلی دی۔ ساڑھی تمہارے لئے مزید ملنے گا۔ یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہو گی۔

چمپا مسکرا کر بولی۔ چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی۔ گذر ہوتی جائے یہی بہت ہے۔

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور حیا سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کالعدم الوجود سمجھتی ہے۔

(۱۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے چھیڑ زیادہ لگا کر چہرہ اٹھایا

اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں، مجھے اسکی اُمید نہ تھی

چمپا نے کہا، کوئی اور بات کرو، زیوروں کی بات سُن کر دل جلتا ہے

"تو ایسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو"

"زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے، میں نے تو ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں جو زیور پہن کر بھی بھدی معلوم ہوتی ہیں"

ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار معلوم ہوتے ہیں، یہ نہ ہوا کہ کہتے۔

"اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لئے لیتے جاؤ"

"تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو"

"اس میں بچپن کی کیا بات ہے کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا"

"میں نے سخی کوئی نہیں دیکھا، جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے"

"میں غیر نہیں ہوں، ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں، اگر سو دو سو کی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی، مگر اہلِ ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی"

رات کے بارہ بج گئے ہیں پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی، بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی

یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا، آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے، اسے چمپا پر رحم آگیا، یہی تو کھانے پہننے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بیچاری کو ہر ایک چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے، وہ دبے پاؤں گھر سے باہر

چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فیٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں۔ اگر وہ جاگ گئے تو ان سے ہنس دوں گا اور کہوں گا، کیا چونکا دیا۔ کہہ دوں گا، میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لئے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے۔ کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پوبارہ ہیں، سب نوکروں پر شبہ کریں گے میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے ان کے سوا اور کون یہ جا سکتا ہے، میں تو وہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا، پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چھپا کر دوں گا جس سے کوئی شک نہ گذرے۔

پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا۔

بڑا غضب ہو گیا رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے۔

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا۔ کسی نے پکڑا نہیں چور کو؟

کسی کو خبر بھی نہیں۔ وہی ڈبے لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑا لی۔ اور انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبہ رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہوگی۔ باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تیوروں پر اڑے ہیں۔"

"نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ آج موقع دیکھا اڑا لے گئے۔"

"تم جا کر ان کو تسلی دو، ٹھکرائن بے چاری رو رہی تھیں۔ تمہارا نام لے لے کر کہتی تھیں کہ پچھلے مہینوں ان زیوروں کے لئے دوڑا، ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اندر چور مونڈی کاٹے نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔"

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا، یہ تو بڑا غضب ہو گیا ماتا جی، مجھے تو ابھی ابھی چچا نے بتلایا۔

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بولے کہیں سیندھ نہیں، کوئی تالا نہیں ٹوٹا، کسی دروازے کی چول نہیں اتری۔ سمجھ میں نہیں آتا چور کدھر سے آیا۔

ٹھکرائن نے رو کر کہا میں تو لٹ گئی بھیا، [illegible] تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی، تب کہیں جا کر چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں۔ نہ جانے کتنی کھوٹ سانٹ میں بنوائی تھیں۔

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا، مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔

ٹھکرائن نے مخالفت کی، ارے نہیں بھیا۔ نوکروں میں کوئی نہیں۔ دس دس ہزار روپے یونہی اوپر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا، تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلد بدل جاتا ہے۔ جس نے ابھی تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑا دیا ہو گا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہی ہو جائے گا۔ بولے پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا۔ تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کر لے گا۔ تم خود کچھ بھی تو نہیں کر سکتے اور پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔ مال چلا گیا، اب کیا ملے گا۔

پرکاش۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

ٹھاکر۔ کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ لگا دے تو البتہ مال نکل آئے۔ لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں، نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہو اور کیا۔

پرکاش۔ آپ بیٹھ رہیے لیکن میں بیٹھنے والا نہیں۔ میں انہیں لوگوں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔

ٹھکرائن۔ نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے۔ کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو۔ پر چھت آیا باہر سے تمہارے کوٹھے سے بھی تو آ سکتا ہے۔

ٹھاکر۔ ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہی نہیں رہ گیا؟

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ ہاں کوئی پہلے سے موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔

تینوں آدمی چھت پر گئے، تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان

دکھائی دیئے جہاں پرکاش کا پلنگ پڑا تھا۔ وہاں کا چونہ لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جاکر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیتے ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔

ٹھاکر صاحب نے کہا، ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا مال تو جانا تھا، وہ گیا، اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہوگی۔

پرکاش۔ میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔

ٹھاکر۔ کیوں ہمیں تمہارا......

پرکاش۔ آپ نہ کہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں، میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی۔ میرا دروازہ تو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے، ممکن ہے وہ چار دن میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت ہے سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے۔ ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر چڑھ گیا، تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی میں گھوم گھوم کر کبھی ۹ بجے آیا کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی ہی گی، ادھر کا راستہ بند ہی ہو جانا چاہئیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔

ٹھکرائن ڈریں۔ تم چلے جاؤ گے بھیا تو گھر اور پھاڑ کھائے گا

پرکاش کچھ بھی ہو ماتا جی۔ مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہو گئی۔ اس کا مجھے خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا، بڑا لائق آدمی ہے چور ادھر سے آیا یہی بات اسے کھا گئی کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھا جائے۔

"ماری تو اسے"

"دیکھ بیٹا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا"

"اب اس گھر میں ہر گو نہ رہے گا۔ کتنا ہی سمجھاؤ"

"کرایہ کے بیس روپے دینے پڑیں گے"

"ہم کیوں کرایہ دیں۔ وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں ہم تو کچھ کہتے نہیں"

"کرایہ تو دینا ہی پڑے گا۔ ایسے آدمی کے لئے کچھ تم بھی کمانا پڑے تو

بُرا نہیں لگتا"

"میں تو سمجھتی ہوں کرایہ لیں گے بھی نہیں"

"تیس روپے میں گذر بھی تو نہ ہو گی"

(۵)

پرکاش نے اُسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہتے ہیں خوش تھا لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی، اکثر تمام دن نہیں رہتے تھے۔ چیش بندی کے لئے چمپا سے کہا ایک سیٹھ جی کے ہاں ۵۰ روپیہ ماہوار کا اور کام مل گیا ہے، مگر وہ روپیہ میں انہی کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہو گی اس میں سے ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا۔ خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پاکر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا اپنا تاؤں میں اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا نا تھا چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک صندوق اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اس کی چابی کہاں۔ اس کا چمپا کو پتہ نہیں وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں۔ کچھ نہیں پرانی کتابیں ہیں ماری ماری پھرتی

تھیں ٹھاٹھا کے صندوق میں بند کر دی ہیں۔ چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انہیں پان دینے گئی، تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی اُن کا چہرہ فق ہو گیا، جیسے کا اُکھڑا سا نکلا، مگر پانی پی کر سوکھ گیا۔ چمپا کبھی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی جس سے شبہے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لئے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی۔ اس دن سے پرکاش کمرہ ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی کے مارے دم گھٹتا تھا، چمپا نے باہر سونے کے لئے کہا مگر پرکاش نہ مانا، اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے۔

چمپا نے کہا، چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی، چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں، یہاں کیا رکھا ہے۔

پرکاش نے غصّہ سے کہا کچھ نہیں ہے، برتن تو ہیں۔ غریب کے لئے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی، تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا۔ صندوق تم نے ہٹایا تھا؟

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی، جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی میں کیوں ہٹانے لگی۔

"پھر کس نے ہٹایا؟"

"میں نہیں جانتی؟"

"گھر میں تم رہتی ہو جانے کون؟"

"اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی



کچھ یوں ہی پوچھتا تھا۔"

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں۔ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی، وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں، پکوڑیاں گرما گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھم سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لئے بولا۔ طشتری میں کیا لائیں، آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔

اچھا پکوڑیاں ہیں۔

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ انکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آ نکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک ایک زیور نکال کر دیکھا۔ یہ کہاں سے آئے، مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال گزرا۔ یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایکدم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لئے انہیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں، چوری زیوروں کے لئے، ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟

(۶)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی، پرکاش سے وہ محبت نہ رہی، نہ وہ عزت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہو جاتی، پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے، مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے۔ آپس میں ہمدردی تھی، مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بنک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکونٹینٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے۔ پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟

پرکاش نے سر جھکا کر کہا۔ دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں۔

"ابھی درخواست تو دو، اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔"

پرکاش نے حیران ہو کر کہا۔ آپ زرِ ضمانت داخل کر دیں گے؟

"ہاں ہاں یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی، مگر پھر بھی خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور احسان کے اس بار نے زبردست احساسِ ماتحتی پیدا کر دیا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینہ پن کو بتائے

دالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوشخبری سنائی، چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا،

پھر ایک منٹ بعد بولی، ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی، جگہ نہ ملتی نہ سہی؟

روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں، روپے پیسے کا معاملہ ہے، کہیں بھول چوک ہو جائے تو

تمہارے ساتھ ان کے پیسے بھی جائیں۔

"یہ تم کیسے کہتی ہو کہ بھول چوک ہوگی، کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟"

چمپا نے کہا، "آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی"

پرکاش سناٹے میں آگیا، اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا

مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا، وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا، مگر ایسی خوشخبری

سن کر بھی چمپا کا اداس رہنا اس کو کھٹکنے لگا، اس کے دل میں سوال پیدا ہوا، اس کے

الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے۔ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا اس

سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نذر کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا، تم نے کیا سوچ کر کہا

کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی! جیسے، اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا، کچھ نہیں میں نے دنیا کی بات کہی تھی۔

پرکاش کو تسلی نہ ہوئی، اس نے پوچھا،

"کیا جتنے آدمی بنک میں ملازم ہیں، ان کی نیت بدلتی رہتی ہے؟"

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا، تم تو زبان پکڑتے ہو، ٹھاکر صاحب کے

ہاں شادی میں ہی تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے، سو دو سو روپیہ کی چیز گھر میں رکھ

ہی لی۔

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اتر گیا۔ مسکرا کر بولا، اچھا تمہارا اشارہ

اس طرف تھا۔ لیکن میں نے کمیشن کے سوا نے ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی۔ اور کمیشن اپنا
تو کوئی باپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔

چمپا نے نفرت کے لہجہ میں کہا جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے۔
اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی بھی لینا گناہ سمجھتی ہوں۔ تمہاری شرافت جب جانتی کہ تم کمیشن
کے روپے جا کر ان کے حوالے کر دیتے۔ ان چھ مہینوں میں انہوں نے تمہارے ساتھ کیا
کیا سلوک کئے ہیں دیا ہی ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ ۲۰ روپیہ ماہوار دیئے جاتے
ہیں؟ علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے، تمہارے ہاں فرزند بھیجتے ہیں۔ تمہارے پاس گھڑی
نہ تھی۔ اپنی گھڑی تمہیں دے دی۔ تمہاری کہاران جب ناغہ کرتی ہے خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج
دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انہوں نے ادا کی اور دن میں دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے
تھے۔ یہ ضمانت ہی کیا چھوٹی بات ہے۔ اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت تو جلدی سے کوئی کرتا
ہی نہیں۔ تمہاری ضمانت کے لئے نقد دس ہزار روپے نکال کر دیئے۔ اسے تم چھوٹی بات
سمجھتے ہو۔ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔ جو آدمی اپنے
اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لئے ہمیں جان قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار
رہنا چاہیئے۔

پرکاش کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے
پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل
کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔
کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس لئے کہ وہ تصویر
ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے، وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا
پڑا تھا، اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا
ہے۔ تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے افسوس۔ چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش

کی انسانیت کو بیدار کر دیا، وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا
دل میں دبی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

(۵)

کئی روز گذر گئے۔ پرکاش کو بنک میں ملازمت مل گئی، اس تقریب میں اس کے ہاں مبارکباد کی دعوت ہے، ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ، ویرانند اور اس کی نئی دلہن بھی آئے ہوئے ہیں، باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں، کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔ پرکاش نے کہا، آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا، دادا! میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔

چمپا کو اس کی یہ ضد بُری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے، رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہ اس کی سمجھ میں نہ آئی، لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا، یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے، ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں تینوں عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا، ویرانند کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا، پرکاش نے گچھا اٹھا لیا، پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا، کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا، اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے، لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا آج کانٹا نکلنے کا، تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارت، اضطراب اور خلش سے بھرا، اب بخار کا اتار تھا، سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا، تب قدم پیچھے ہٹتا تھا، آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویرانند کا کمرہ کھولا اور

اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہ رکھ دیا، پھر فوراً باہر آکر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا۔ ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس مسرت کا لطف اٹھا رہے تھے ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ ویرندر کو اپنے قصور سے جلتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی، گویا کہ کسی گہرائی انتہا گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے۔ اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو ویرندر سویا ہوا تھا، چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا، دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویرندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا، بابوجی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی شاندار تھی۔ جو زیورات چوری گئے تھے سب مل گئے۔

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے، اور بولے بڑی شاندار دعوت تھی، تمہاری، پورا کا پورا ڈبہ مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی، جیسے امانت رکھنے کے لئے ہی لے گیا ہو۔

پرکاش کو ان کی باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری گیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا، تعجب کی بات ہے۔

میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

ٹھاکر۔ کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمہاری ہی کیوں وید کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا۔

پرکاش۔ اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔

ٹھاکر۔ آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہوگی۔

پرکاش۔ آپ نے کوئی منتر وغیرہ تو نہیں پڑھوا لیا کسی سے۔

ٹھاکر۔ کئی پنڈتوں سے۔

پرکاش۔ تو بس یہ اسی کی برکت ہے۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوشخبری سنائی وہ دوڑ کر ان کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی، جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا آج ان کے ہاں میری دعوت ہے۔

" میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی "

" تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو "

" مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا "

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔



آشیاں برباد

(۱)

مردلا مجسٹریٹ کے اجلاس سے زنانہ جیل میں واپس آئی تو اُس کا چہرہ شگفتہ تھا۔ بری ہو جانے کی گلابی اُمید اس کے رخساروں پر چمک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سیاسی قیدیوں کے گروہ نے اسے گھیر لیا اور پوچھنے لگیں کتنے دن کی ہوئی بہن۔

مردلا نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا۔ میں نے دھرنا نہیں دیا۔ یوں آپ زبردست ہیں، جو فیصلہ چاہیں کریں، نہ میں نے کبھی کو روکا نہ پکڑا نہ دھمکایا۔ نہ کسی سے آرزومنت ہی کی۔ کوئی خریدار میرے سامنے آیا ہی نہیں۔ ہاں میں دوکان پر کھڑی ضرور تھی۔ وہاں کئی والنٹیر گرفتار کر لئے گئے تھے۔ خلقت جمع ہو گئی تھی۔ میں بھی کھڑی ہو گئی۔ بس تھانیدار نے آکر مجھے گرفتار کر لیا۔

کھمادیوی بھی کچھ قانون جانتی تھی۔ بولی یہ تو ایک طرح سے اپنی صفائی

دینے کے برابر ہے۔

مردلا نے ذرا تردید کی۔ میں مقدمہ کی کسی کاروائی میں شریک نہ ہونا چاہتی
تھی۔ لیکن جب میں نے ان لوگوں کو سراسر جھوٹ بولتے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں
نے ان سے جرح کرنا شروع کی۔ میں نے بھی اتنے دنوں گھاس نہیں کھودی ہے۔ تھوڑا سا
قانون جانتی ہوں۔ پولیس والوں نے سمجھا ہوگا، یہ کچھ بولے گی تو ہے نہیں۔ ہم جو بیان چاہیں
گے دے دیں گے۔ جب میں نے جرح شروع کی تو سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے
میں نے تینوں گواہوں کے بیان کو فرضی ثابت کر دیا ہے، اس وقت جانے مجھے کیونکر
نکتے سوجھتے گئے۔ مجسٹریٹ نے تھانہ دار صاحب کو دو تین بار پھٹکار بھی بتائی۔ وہ میرے
سوالوں کا اول جلول جواب دیتا تھا تو مجسٹریٹ بول اٹھتا تھا، وہ جو کچھ پوچھتی ہیں اس
کا جواب دیجئے۔ فضول کی باتیں کیوں کرتے ہو۔ تب حضرت کا چہرہ ذرا سا نکل آتا تھا۔
میں نے سبھوں کو لاجواب کر دیا۔ ابھی مجسٹریٹ نے فیصلہ نہیں سنایا۔ لیکن مجھے یقین ہے،
بری ہو جاؤں گی۔ میں جیل سے نہیں ڈرتی لیکن بے وقوف بھی نہیں بننا چاہتی۔ وہاں
سیکریٹری صاحب بھی تھے اور بہت سی بہنیں تھیں۔ سب یہی کہتے تھے کہ تم چھوٹ
جاؤ گی۔

عورتیں اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ایک ایک کر کے
چلی گئیں۔ ان میں سے کسی کی میعاد سال بھر کی تھی، کسی کی چھ مہینے کی۔ کسی نے بھی
عدالت کی کاروائیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کے مشرب میں یہ کفر سے کم نہ تھا۔ مردلا
پولیس سے جرح کر کے ان کی نظروں میں گر گئی تھی۔

دور جا کر ایک دیوی نے کہا۔ اس طرح تو ہم لوگ بھی چھوٹ جاتے،
ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ سرکاری عدالتوں سے ہمیں انصاف کی کوئی امید نہیں۔

دوسری خاتون بولیں۔ یہ تو معافی مانگ لینے کے برابر ہے۔ گئی تھیں دھرنا

دیتے ورنہ دوکان پر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ والنٹیر گرفتار ہوئے تھے۔ آپ کی بلا سے،
آپ وہاں کیوں گئیں۔ مگر اب کہتی ہیں، میں دھرنا دینے گئی ہی نہیں یہ تو معافی مانگنا ہوا۔
تیسری دیوی نے فرمایا۔ جیل میں رہنے کے لئے کلیجہ چاہئے۔ اسوقت
تو واہ واہ کہلانے کے لئے آگئیں جیسی عورتوں کو تو قومی کام کے نزدیک ہی نہ آنا چاہئے۔
تحریک کو بدنام کرنے سے فائدہ۔

(۲)

صرف چھما دیوی اب تک مردلا کے پاس متفکر کھڑی تھی۔ اس نے ایک تقریر کرنے کے الزام میں سال بھر کی سزا پائی تھی، دوسرے ضلع سے تبدیل ہو کر ایک مہینہ ہوا یہاں آئی تھی ابھی معیاد پوری ہونے میں آٹھ ماہ باقی تھے۔ یہاں کے چند قیدیوں میں سے کسی سے اس کا دل نہ ملتا تھا۔ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے ان کا آپس میں جھگڑا، آرائش اور شوق کی چیزوں کے لئے لیڈی وارڈوں کی خوشامدیں کرنا، گھر والوں سے ملنے کے لئے ان کا اضطراب اسے پسند نہ تھا۔ وہی بدگوئیاں اور سرگوشیاں جیل کے اندر بھی تھیں، وہ خودداری جو اس کے خیال میں ایک سیاسی قیدی میں ہونی چاہئے کسی میں بھی نہ تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت اپنے خانگی معاملات کے چرچا میں صرف ہوتا تھا۔ چھما ان سے اعتراض کرتی تھی۔ اسکو قوم کا فدایانہ جوش تھا، اور سچا درد۔ مگر دوسری دیویاں اسے معذور سمجھتی تھیں اور اعتراض کا جواب اعتراض سے دیتی تھیں۔ مردلا کو حراست میں آئے آٹھ دن ہوئے تھے۔ اتنے ہی دنوں میں چھما کو خاص انس ہو گیا تھا۔ مردلا میں تنگ دلی اور رقابت نہ تھی، نہ کوئی بدگوئی کی عادت۔ نہ آرائش کا خبط، نہ بیہودہ مذاق، اس نے مہربانہ دل پایا تھا۔ جوش خدمت سے پر، ہمدردی سے لبریز۔ چھما نے سوچا تھا۔ اس کے ساتھ چھ مہینے لطف سے گذر جائیں گے لیکن تقدیر اسے یہاں بھی پامال

کرنے پر آمادہ تھی، کل مردلا یہاں سے چلی جائے گی، پھر وہ اکیلی ہو جائے گی۔ یہاں ایسا کون ہے جس کے ساتھ وہ گھڑی بھر بیٹھ کر دل کی باتیں کہے گی۔ ملک اور قوم کا چرچا کرے گی، جس کی صحبت میں مغائرت یا ہمدردی کی بو نہ آئے۔

مردلا نے پوچھا، تمہیں تو ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں۔ بہن بڑی مشکل سے گنیں گے۔

چھما نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ کبھی نہ کبھی طرح کٹ ہی جائیں گے بہن، مگر تمہاری یاد ہمیشہ ستایا کرے گی۔ اس ایک ہفتہ کے اندر تم نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا۔ جب سے تم آئی ہو، مجھے یہ جیل خانہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ملتی رہنا۔

مردلا نے دیکھا، چھما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ تشفی کے انداز سے بولی ضرور ملوں گی بہن۔ مجھے تو خود بغیر تم سے ملے چین نہ آئے گا۔ بھان کو بھی لاؤں گی، کہوں گی تیری ماسی آئی ہے، تجھے بلا رہی ہے۔ دوڑا ہوا آئے گا۔ اب تم سے آج کہتی ہوں بہن یہاں مجھے کسی کی یاد آتی تھی تو بھان کی۔ بیچارا اماں اماں کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہوگا۔ اور روتا ہوگا۔ مجھے دیکھ کر روٹھ جائے گا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں، جاؤ میں تم سے نہیں بولتا تم میرے گھر سے نکل جاؤ۔ بڑا شیطان ہے بہن، دم بھر بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ صبح اٹھتے ہی گاتا ہے "جھنڈا الدستاب امالا" "چھولانج کا عندیل ریل ہی ہے" "جھنڈا اونچا رہے ہمارا، سوراج کا مندر جیل ہی ہے" جب ایک جھنڈی کندھے پر رکھ کہتا ہے "تالی چھلاب پینا حرام ہے" تو دیکھتے ہی بنتا ہے۔ باپ کو تو کہتا ہے تم گلام ہو۔ ایک انگریزی کمپنی میں نوکر ہیں۔ بار بار سوچتے ہیں استعفیٰ دے دوں لیکن گذر بسر کی بھی تو کوئی صورت ہو، کیسے چھوڑیں! وہ اب تک چھوڑ دیئے ہوتے بہن تم سے سچ کہتی ہوں نوکری سے انہیں نفرت ہے۔ لیکن میں ہی منع کرتی رہتی ہوں۔ بیچارے کیسے دفتر جاتے ہوں گے، کیسے بھان کو سنبھالتے ہوں گے، ساس جی کے پاس تو رہتا ہی نہیں۔ وہ بیچاری بوڑھی

اس کے ساتھ کہاں کہاں دوڑیں، چاہتی ہیں کہ میرے پاس بیٹھا رہے، دو پل بھر نچلا نہیں بیٹھتا۔ اماں بہت بگڑیں تھی، بس یہی ڈر لگ رہا ہے مجھے دیکھنے ایک دن بھی نہیں آئیں، کل بابو جی کہتے تھے، تم سے بہت ناراض ہیں، تین دن تو دانہ پانی چھوڑ دیا تھا، اس چھوکری نے کل کی مرجاد ڈبادی، خاندان میں داغ لگا دیا، کل مونہی کچھنی، نہ جانے کیا کیا بکتی رہی، میں تو ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی، بہن پرانے زمانے کی ہیں، ان سے کوئی چاہے کہ تم لوگوں میں آ کر مل جائیں تو یہ اس کی زیادتی ہے کل جلسہ کرنا پڑے گا، بڑی منتوں سے مانیں گی، کل ہی کتھا ہو گی، دیکھ لینا، براہمن کھائیں گے بھیل کھانا کا پرایشچت تو کرنا ہی پڑے گا، تم ہمارے گھر ایک دو دن رہ کر تب جانا بہن، میں تمہیں آ کر لے جاؤں گی۔

چھما کو ان خوشیوں میں سے ایک بھی نصیب نہ تھی، وہ اکیلی بیوہ تھی، جلیانوالے باغ میں اس کا آشیانہ برباد ہو گیا تھا، شوہر مارا گیا، لڑکے مارے گئے، اب کوئی ایسا نہ تھا، جسے وہ اپنا کہہ سکتی اور ان دس برسوں سے اس کا غمزدہ نصیب دل قوم کی خدمت میں تشفی اور سکون کی تلاش کر رہا تھا، جس اسباب نے اس کے بسے ہوئے گھر کو ویران کر دیا اس کے سہاگ کو لوٹا، اس کی گود سونی کر دی، ان اسباب کو مٹانے میں مجنونانہ جوش کے ساتھ مصروف تھی، بڑی سے بڑی قربانیاں تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی، اب اس کے پاس اپنے دل و دماغ کو قربان کرنے کے سوا اور رہ ہی کیا گیا تھا، اور عمل کے سلئے خدمت قوم، تہذیب کا ایک تقاضا ہو یا نمود کا ایک ذریعہ اس کے لئے تو یہ عبادت تھی، اور وہ اپنی سادی نسوانی عقیدت اور انہماک کے ساتھ اسے بجالاتی تھی، لیکن طائر کو آسمان پر پرواز کرنے کے بعد اپنے آشیانہ کی یاد تو آتی ہی ہے، چھما کا یہ آشیانہ کہاں تھا، یہی تو وہ موقع تھا جب اس کا دل ہمدردی کے لئے فراد ہو جاتا تھا، یہاں درد شناس مردلا کو پا کر وہ اپنی قسمت کی تعریف کر رہی تھی، مگر یہ محبت بھی اتنی جلدی

برہم ہو گئی۔

چھما عبرتناک انداز سے بولی۔ یہاں سے جاکر بھول جاؤ گی، مردلا تمہارے لئے یہ ریل گاڑی کی ملاقات ہے، اور میرے لئے تمہارے وعدے اس ملاقات کے وعدے ہیں کبھی کہیں ملاقات ہو جائے گی تو پہچانوگی ہی نہیں، یا ذرا مسکرا کر ہنستے ہنستے بولی اپنی راہ چلی جاؤ گی یہی دُنیا کا دستور ہے۔ اپنے رونے سے فرصت ہی نہیں ملتی، دوسرے کے لئے کیونکر روئے، تمہارے لئے تو میں کچھ نہیں تھی، میرے لئے تم سب کچھ تھیں اپنے پیاروں میں بیٹھ کر کبھی کبھی مجھے ضرور یاد کر لیا کرنا، بھکاری کے لئے جھپٹی بھر آٹا ہی بہت ہے۔

دوسرے دن مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا، مردلا رہا ہو گئی، شام کو وہ سب بہنوں سے گلے مل کر رو رو کر، رخصت ہو گئی، گویا میکے سے جدا ہوئی ہو۔

(۳)

تین مہینے گذر گئے مگر مردلا ایک بار بھی نہ آئی، اور قیدیوں سے ملنے والے آتے رہتے تھے، لعضوں کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں بھی آجاتی تھیں، لیکن چھما کو کون پوچھنے والا تھا، ہر مہینے کے آخری، اتوار کو وہ صبح سے مردلا کا انتظار کرنے لگتی، جب ملاقات کا وقت گذر جاتا تو ذرا دیر رو کر دل کو سمجھا لیتی، زمانہ کا یہی دستور ہے۔

ایک دن شام کو چھما سندھیا کر کے اٹھی تھی کہ دیکھا مردلا سامنے چلی آرہی ہے۔ نہ وہ چہرہ ہے نہ وہ رونق، دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی، اور روتی ہوئی بولی، یہ تیری کیا حالت ہے، مردلا صورت ہی بدل گئی، تم بیمار ہو گیا؟ مردلا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، بولی بیمار تو نہیں ہوں بہن،

مصیبت زدہ ہوں۔ تم مجھے بے وفا اور وعدہ فراموش سمجھتی ہو گی۔ ان ساری شکایتوں کی تلافی کرنے آئی ہوں، اور سارے فکروں سے آزاد ہو کر آئی ہوں۔

چھما کا دل کانپ اٹھا۔ سینہ کی گہرائیوں سے ایک لہر سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بولی، خیریت تو ہے؟ اتنی جلدی تم پھر یہاں کیوں آگئیں، ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔

مردانہ تبسم کے ساتھ بولی، اب سب خیریت ہے بہن، ہمیشہ کیلئے خیریت ہو گئی، کوئی فکر نہیں رہی۔ اب یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے تیار ہوں، تمہاری محبت کی کشش اب معلوم ہوئی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ تمہیں باہر کی خبریں کیا ملی ہوں گی، برسوں شہر میں گولیاں چلیں، دیہاتوں میں آج کل لگان وصول کیا جا رہا ہے۔ کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں، غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور دن بدن بھاؤ گرتا جا رہا ہے۔ پونے دو روپے میں من بھر گیہوں آتا ہے، میری عمر ہی کیا ہے، اماں بھی کہتی ہیں، اتنا سستا غلہ کبھی نہیں تھا، کھیت کی پیداوار سے بیجوں تک کے دام نہیں آتے۔ سینچائی اور محنت سب اوپر، غریب کہاں سے دیں، سرکار کا حکم ہے کہ جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے کسان اس پر بھی راضی ہیں کہ ہمارے مال و اسباب نیلام کر لو، قرق کر لو، اپنی زمین لے لو، مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگزاری دکھلانے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ پھر دی گنج کا علاقہ پیٹا جا رہا ہے، مرتا کیا نہ کرتا، ایک کسان کے گھر میں آکر کئی کانسٹیبلوں نے اسے پیٹنا شروع کیا بیچارہ بیٹھا مار کھاتا رہا۔ اس کی بیوی سے نہ رہا گیا۔ شامت کی ماری کانسٹیبلوں کو گالیاں دینے لگی۔ بس ایک کانسٹیبل نے اسے برہنہ کر دیا اور اب بہن کیا کہوں، ہمارے بھائی اتنی بے رحمی کریں، اس سے زیادہ شرمناک اور کیا ہو گا، ایک کسان سے ضبط نہ ہوا، کبھی پیٹ بھر غریبوں کو کھانے کو ملتا نہیں، اوپر اتنی بڑی مشقت، جسم میں نہ طاقت باقی ہے

ہے۔ نہ ہمت۔ مگر انسان کا دل ہی تو ٹھہرا، بیچارہ بے دم پڑا ہوا تھا، بیوی کا چلانا سن کر اُٹھ بیٹھا اور اس بدمعاش کانسٹیبل کے زور سے دھکا دے کر اس سے لپٹ گیا۔ ایک کسان وہ بھی پولیس کے آدمی کے ساتھ اتنی بے ادبی کرے، اسے بھلا وہ کہیں برداشت کر سکتا ہے۔ سب کانسٹیبلوں نے غریب کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔

چھما۔ گاؤں کے اور لوگ تماشا دیکھتے رہے ہوں گے۔

مردلا۔ اس میں بھی آفت ہے۔ اگر دس بیس آدمی جمع ہو جاتے تو پولیس سمجھتی کہ مزاحمت کرنے آئے ہیں، شاید ڈنڈا چلانا شروع کر دیتی، اور اگر کوئی آدمی غصہ میں ایک آدھ پتھر پھینک دیتا تو گولیاں چلا دیتی، دو چار آدمی بھن جاتے، اسی لئے لوگ جمع نہیں ہوتے لیکن جب وہ کسان مر گیا تو گاؤں والے طیش میں آئے، لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور کانسٹیبلوں کو گھیر لیا، ممکن ہے دو چار آدمیوں نے لاٹھیاں چلائی ہوں۔ کانسٹیبلوں نے گولیاں چلانی شروع کیں، دو کانسٹیبلوں کو چوٹیں آئیں، اس کے بدلے میں دس بارہ آدمیوں کی جانیں لے لی گئیں، چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اختیارات مل جاتے ہیں تو یہ لوگ اس کا بے جا استعمال کرنے لگتے ہیں گاؤں کے غریب لوگوں پر اپنا رعب جما کر کانسٹیبل فتح کے نقارے بجاتے ہوئے لوٹ گئے، گاؤں والوں کی فریاد کون سنتا، غریب ہیں، بیکس ہیں بے زبان ہیں، جتنے آدمیوں کو چاہو مار ڈالو، حکام اور عدالت سے انہوں نے انصاف کی اُمید چھوڑ دی، سوچتے ہیں، آخر اسی سرکار نے تو کانسٹیبلوں کو تعینات کیا تھا۔ وہ سرکار کسانوں کی فریاد کیوں سننے لگی؟ مگر آدمی کا دل بغیر فریاد کئے نہیں مانتا، گاؤں والوں نے اپنے شہر کے بھائیوں سے فریاد کرنے کا فیصلہ کیا، بیکس اور کچھ نہیں کر سکتی، ہمدردی تو کر لی ہے۔ غم کی داستان سن کر آنسو تو بہاتی ہے، مظلوم کے لئے ہمدردی کے آنسو بھی کم پیارے نہیں ہوتے اگر آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو کر ہمدردی کرتے تو ان غریبوں کی تشفی ہو جاتی، مگر پولیس نے اس گاؤں میں لوگوں کا آنا جانا بند کر دیا تھا، چاروں سمت پر کانسٹیبل کھڑے

کر دیئے گئے تھے، یہ زخم پر نمک تھا، مارتے بھی ہو اور رونے بھی نہیں دیتے، آخر لوگوں نے لاشیں اٹھائیں اور شہر والوں کو اپنی مصیبت کی کہانی سنانے لے آئے ہنگامہ کی خبر پہلے ہی شہر میں پہنچ چکی تھی، ان مظلوموں کو دیکھ کر پبلک میں اشتعال ہو گیا۔ اور جب سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان لاشوں کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تو لوگ اور بھی جھلائے، بہت بڑا مجمع ہو گیا، میرے بابو جی بھی اس مجمع میں تھے سمجھاتی رہی مت جاؤ، آج کارنگ اچھا نہیں ہے کہنے لگے میں کسی سے لڑنے تھوڑے ہی جاتا ہوں، پچاس ہزار آدمی جنازے کے ساتھ تھے، اور پانچ سو مسلح پولیس روکے ہوئے تھی، سوار اور پیادے پوری فوج تھی جب بار بار پولیس کی دھمکیوں پر بھی مجمع منتشر نہ ہوا تو گولیاں چلانے کا حکم ہو گیا۔ فائر ہونے لگے۔ کتنے گھائل ہوئے، کون جانتا ہے، میرا مکان لب سڑک ہے۔ میں اپنے چھجے پر کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی، ہزاروں آدمی بھاگے چلے آرہے تھے، بہن وہ نظارہ یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسی دہشت ایسی سراسیمگی کہ تم سے کیا کہوں، مگر ان بھاگنے والوں کے پیچھے سرفروش جانبازوں کی ایک جماعت تھی جو دیوار کی طرح مستقل کھڑے گولیاں کھا رہے تھے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے، بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھی اور ہر ایک دھائیں کے بعد ہزاروں گلوں سے جے کی صدا نکلتی تھی، اس صدا میں کتنی کشش تھی، کتنا جوش! بس یہی جی چاہتا تھا کہ جا کر گولیوں کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور ہنستے ہنستے مر جاؤں، اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مر جانا کوئی کھیل ہے، اماں جی کمرے میں بھان کو لئے چھجے پر آگئیں، اسی وقت دس بارہ آدمی ایک سٹریچر پر میرے سوامی کی لاش لئے ہوئے دروازے پر آئے، اماں کی ان پر نظر پڑی سمجھ گئیں، مجھے تو سکتہ سا ہو گیا۔ اماں نے جا کر ایک بار لاش کو دیکھا اسے چھاتی سے لگایا اس کا بوسہ لیا اور سیدھی چوراہے کی طرف چلیں، جہاں سے اب بھی دھائیں اور جے کی آوازیں آرہی تھیں، میں نقش دیوار بنی لاش کو دیکھتی تھی کبھی اماں جی کو، نہ کچھ بولی، نہ جگہ سے ہلی۔

نہ روئی۔ نہ بے قرار ہوئی، احساس کی مجھ میں قوت نہ رہی تھی، اماں جی جانبازوں کی صف میں جا کر سامنے کھڑی ہو گئیں اور ایک منٹ میں ان کی لاش بھی زمین پر گر پڑی، ان کے گرتے ہی جانبازوں کا ضبط بھی رخصت ہو گیا، ان کے سر پر خون سا سوار ہو گیا، نہتے تھے مگر ہر ایک فرد اپنے دل میں شیر کی قوت محسوس کر رہا تھا، سپاہیوں نے اس سیلاب کو آتے دیکھا تو ہوش اُڑ گئے جانیں لے کر بھاگے، کوئی ادھر کوئی ادھر مگر بھاگتے ہوئے بھی گولیاں چلاتے تھے بھان پیچھے پر چھجا کھڑا تھا نہ جانے کدھر سے آ کر ایک گولی اس کے سینہ میں لگی میرا لال وہیں گر پڑا، سانس تک نہ لی۔ مگر میری آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے۔ میں نے بھان گود میں اٹھا لیا، اس کے سینے سے خون جاری تھا، میں نے اسے جو دودھ پلایا تھا، اسے وہ خون سے ادا کر رہا تھا، اس کے خون سے تر کپڑے پہنے ہوئے مجھے ایسا فتحمندانہ غرور ہو رہا تھا جو شاید اس کے بیاہ میں ریشمی کپڑے پہن کر بھی نہ ہوتا لڑکپن، جوانی اور موت ساری منزلیں ایک ہی ہچکی میں تمام ہو گئیں۔ میں نے بیٹے کی لاش کو باپ کی گود میں دے دیا اتنے میں اماں جی کا جنازہ بھی آ پہنچا معلوم ہوتا تھا، لیٹی ہوئی مسکرا رہی ہیں، مجھے تو روکتی رہتی تھیں اور خود اس طرح بھاگ کر آگ میں کود پڑیں، گویا یہی سورگ کا راستہ ہو جب ندی کے کنارے ایک ہی چتا میں لاشیں رکھی گئیں، تب میرا سکتہ ٹوٹا، ہوش آیا، ماں اپنے جنم بھر کی کمائی لئے جاتی ہے۔ جنہیں نانوں سے پالا، انہیں چھوڑ کیسے جاتی وہ تو وہاں بیٹے اور پوتے کے ساتھ گئیں میرے لئے کیا چھوڑا، ایک بار جی میں آیا میں بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں، سارا کنبہ ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جا پہنچے لیکن پھر میں نے سوچا، تو نے ابھی ایسا کام ہی کون سا کیا ہے جس کا معاوضہ یہ ملے۔ بہن اس چتا کی لپٹوں میں مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اماں جی سچ مچ بھان کو گود میں لئے بیٹھی مسکرا رہی ہیں اور سوامی جی مجھ سے کہہ رہے ہیں، تم جاؤ اور بے فکر ہو کر کام کرو۔ ان کے چہروں پر کتنا جلال تھا، خون اور

آگ میں ہی تو دیوتا بنتے ہیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، ندی کے کنارے نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی تھیں، دور سے یہ جلتی ہوئی چتائیں مشعلوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں، جیسے دریا کے پل پر برقی لالٹینوں کی ایک قطار ہو، اسی پل پر ہو کر شہادت کی منزل ہے، اور یہی مشعلیں لقائے دوام کی طرف لے جاتی ہیں، یا یہ بھٹیاں تھیں جن میں بھارت کی تقدیر گھڑی جا رہی تھی۔

جب چتائیں راکھ ہو گئیں تو ہم لوگ لوٹے، لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی، میرے لئے اب وہ گھر نہ تھا، میرا گھر اب یہ ہے جہاں میں بیٹھی ہوں یا پھر وہی چتائیں نے گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا، مہیلا آشرم چلی گئی، کل کی گولیوں میں کانگریس کمیٹی کا صفایا ہو گیا تھا۔ کانگریس باغی انجمن قرار دیدی گئی تھی۔ اس کے دفتر پر پولیس نے چھاپہ مارا اور اس پر اپنا قفل ڈال دیا، مہیلا آشرم پر بھی حملہ ہوا، اس پر بھی قفل ڈال دیا گیا۔ ہم نے ایک درخت کے سایہ میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے، شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا، کل کے خونیں واقعہ کی یاد اور خوشی اور مبارک باد میں جلوس نکالنا ضروری تھا، لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے ہم زندہ ہیں مستقل ہیں، میدان سے ہٹے نہیں، ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا، یہ دکھا دینا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبۂ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے، اور پولیس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضروری سمجھا، شاید پبلک کو دھوکا ہو گیا ہو کہ کل کے واقعہ سے سرکار کا اخلاقی احساس پیدا ہو گیا ہے، اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہے، پبلک کے وہم کو دور کرنا۔۔۔ اس نے اپنا فرض سمجھا، وہ یہ دکھانا چاہتی تھی ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے، تمہاری

خوشی یا ناخوشی کی ہم کو پروا بھی نہیں، جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی، پبلک کو ہدایت اور تنبیہ کر دی گئی کہ خبردار جلوس میں نہ آنا ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے مگر شام کے وقت پچاس ہزار کا مجمع ہو گیا۔ آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا، میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا، آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس رتبہ پر پہنچ گئی تھی جو بڑے سے بڑے سرکاری افسر کو بھی، بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں، یہ دلوں کی حکومت تھی، یہ مجمع کیا میرا تنخواہ دار تھا یا اُسے مجھ سے کسی نفع کی اُمید تھی یا نقصان کا خوف، ہرگز نہیں، پھر بھی وہ میرے کڑے سے کڑے حکم کو بسر و چشم ماننے کو تیار تھے، اسی لئے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی جو تڑپ غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کی جو بے چینی ہے میں اس تڑپ اور بے چینی کی زندہ مثال تھی جلوس روانہ ہوا اسی وقت پولیس نے میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا مجھے ...... وارنٹ دیکھتے ہی تمہاری یاد آئی پہلے تمہیں میری ضرورت تھی، اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ پہلے تم مجھ سے ہمدردی کی خواستگار تھیں، اب میں تمہاری ہمدردی کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں اور مجسٹریٹ جو بڑی سے بڑی سزا دے اس کے لئے تیار ہوں۔ اب میں پولیس کی غلط بیانیوں یا بےجا الزام کے خلاف زبان تک نہ کھولوں گی، کیونکہ میں جانتی ہوں آزادی وہ گر جو کچھ کر سکتی ہوں جیل میں اس سے کہیں زیادہ کر سکتی ہوں آزادی میں غلطی کا امکان ہے، بہکنے کا خوف ہے، مصالحت کا اندیشہ ہے رقابت کی فکر ہے، جیل احترام اور عقیدت کا ایک دائرہ ہے جس کے اندر شیطان قدم نہیں رکھ سکتا، میدان میں جلتا ہوا الاؤ ہوا میں اپنی حرارت کھو دیتا ہے، لیکن انجن میں بند وہ کر دہی آگ تحریک کا لاذوال خزانہ بن جاتی ہے۔

اور دیویوں کو بھی خبر ملی، سب کی سب مردانے سے ملنے آ پہنچیں۔ پھر بھارت ماتا کی جے کی صدا جیل کی دیواروں کو توڑتی ہوئی آسمان میں جا پہنچی۔

خانہ داماد

جیٹھ کا دوپہر تھا، ہردھن ایک کھیت میں پانی دے آیا اور باہر بیٹھا رہا۔ گھر میں سے دھواں اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور ساتھ ہی کھن کھن کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے ان دونوں کے لڑکے بھی آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہو گئے مگر ہردھن اندر نہ جا سکا اوپر ایک مہینہ سے اس کے ساتھ یہاں جو برتاؤ ہو رہا تھا اور خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سہنی پڑی تھی وہ اس کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی۔ کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے گھبرا گیا ہے کوئی تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ لئے بیٹھی ہوں؟ سب سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بیدردانہ سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کر دیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو سنتی رہی مگر اس کے منہ سے ایک مرتبہ بھی تو نہ نکلا کہ اماں! تم کیوں ان کی بے عزتی کر رہی ہو؟ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی، شاید میری درگت پر وہ خوش ہو رہی تھی۔ اس گھر میں وہ کیسے جائے کیا

پھیر دی، گالیاں کھانے، وہی دل آزار باتیں سننے کے لئے؟ اور آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گزر جانے پر یہ حال ہو رہا ہے، کیا میں کسی سے کم کام کرتا ہوں دونوں سالے میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں، اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں۔ چھانٹی کاٹتا ہوں وہاں سب لوگ پل پل پر چلم دیتے ہیں۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے کام لگا رہتا ہوں شام کو گھر والے گانے بجانے چلے جاتے ہیں، میں بڑی رات تک گائیں بھینس دوہتا رہتا ہوں۔ ان سب کاموں کے لئے یہ انعام مل رہا ہے کہ کوئی مجھے کھانے کو نہیں پوچھتا الٹی اور گالیاں سننے کو ملتی ہیں۔

اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی "ذرا اسے کنوئیں سے کھینچ تو لو، گھر میں ایک لوٹا پانی نہیں ہے۔"

ہری دھن ڈول لے کر کنوئیں پر گیا، اور پانی بھر لایا۔

اُسے زور سے بھوک لگ رہی تھی، سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی تو وہیں کی ہو رہی، ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا سو گیا۔

دفعتاً اس کی بیوی نے آ کر جگایا۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا۔ کیا ہے۔ کیا ہے۔ کیا پڑا بھی رہنے دے گی کیا اور پانی چاہیئے۔

گمانی سخت لہجہ میں بولی غراتے کیوں ہو، کھانے کو بلانے آئی ہوں۔"

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے بدن میں آگ لگ گئی میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ یہ لوگ

مالک ہیں وہ میں ان کی جھوٹی پتیلی چاٹنے والا ہوں، میں ان کا کتا ہوں، جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے یہی گھر ہے یہاں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی تھی سالے غلام بنے رہتے تھے، ساس منہ جوہتی رہتی تھی، بیوی پوجا کرتی تھی، تب اس کے پاس روپیہ تھا، جائیداد تھی۔ اب وہ مفلس ہے، اس کی ساری جائیداد کو ان ہی لوگوں نے برباد کر دیا۔ اب اسے روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہیں۔ اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اُٹھا کہ اسی وقت اندر جا کر ساس اور سالوں کی خوب لعنت ملامت کرے مگر ضبط کر کے رہ گیا پڑے پڑے بولا "مجھے بھوک نہیں ہے۔ آج نہیں کھاؤں گا۔

گماتی نے کہا "نہ کھاؤ گے میری بلا سے! ہاں نہیں تو! کھاؤ گے تو تمہارے ہی پیٹ میں جائے گا کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا۔

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا یہ میری بیوی ہے جس کیلئے میں نے اپنا سب کچھ سواہا کر دیا مجھے الو بنا کر اب یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے ہیں۔ وہ اب کہاں جائے کیا کرے

اس کی ساس آ کر بولی "چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی، روٹھتے کس سے ہو یہاں تمہارے نخرے اُٹھانے کا کسی میں بل بوتہ نہیں ہے۔ جو دیتے ہو وہ نہ دینا اور کیا کرو گے تم کو بیٹی بیاہی ہے۔ کچھ تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔

ہری دھن نے پیچ و تاب کھا کر کہا "ہاں اماں میری غلطی تھی میں ویسا ہی سمجھ رہا تھا اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکہ لو گی جب میرے پاس روپیہ تھا۔ میں سب کچھ تھا۔ اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھو گی۔

بڑھی ساس منہ پھیلائے ہوئے چلی گئی۔

(۲)

بچوں کے لئے باپ ایک فالتو سی چیز، ایک تکلف ہے جیسے گائے کے لئے کھلی یا بالوؤں کے لئے چٹنی، ماں دال روٹی ہے۔ چٹنی عمر بھر نہ ملے تو حرج ہی کیا ہے؟ مگر روٹی دال ایک دن بھی نہ ملے تو پھر کیا دیکھئے کیا حال ہوتا ہے، باپ کا درشن کبھی کبھی، شام مل جاتا ہے وہ بچہ کو اچھالتا ہے پیار کرتا ہے اور کبھی اسے گود میں لے کر انگلی پکڑ کر سیر کرانے لے جاتا ہے یہ بھی اس کے فرائض کی حد ہے، وہ پردیس چلا جائے بچہ کو پرواہ نہیں ہوتی مگر ماں تو بچے کے لئے سبھی کچھ ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ باپ کہیں ہو، اسے پرواہ نہیں اسے تو صرف ایک اچھالنے کدانے والا آدمی چاہئے مگر ماں تو اس کی اپنی ہی ہونی چاہئے۔ سولہ آنے اپنی، وہی روپ، وہی رنگ، وہی پیار، وہی سب کچھ ہے مگر وہ نہیں ہے تو گویا بچہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے، پھر تو وہ شیو جی کا نادیا ہے جس پر پھول چڑھانا لازمی نہیں محض اختیاری ہے۔

ہری دھن کی ماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا، اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا وہ سولہ سال کا تھا مگر ماں کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں جیسے گھر پر اس کا حق ہی نہ رہا ہو، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، بھائی کوئی نہ تھا بیچارہ تنہا گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا، اماں کے لئے روتا تھا، مگر ماں کے سایہ سے خوف کھاتا تھا، جس کوٹھری میں اس کی جان نکلی تھی ادھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا گھر میں بوا تھی، جو ہری دھن کو بہت چاہتی تھی، اسے اب دودھ زیادہ ملتا تھا۔ کام بھی کم کرنا پڑتا۔ بوا بار بار پوچھتی بیٹا کیا کھاؤ گے؟ باپ بھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے، مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کر سکتے تھے۔ جس نے دل

کو مجروح کر دیا تھا۔ یہ لاڈ پیار بار بار اس کی ماں کی یاد دلاتا۔ ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا۔ وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا۔ مانگ مانگ کر کھاتا تھا، لڑ لڑ کر کھاتا تھا۔ اب وہ بیمار تھا۔ اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتیں تھیں مگر اسے بھوک نہیں ہے۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا، پھر تغیر واقع ہوا۔ ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے، اس کے گھر میں آئی اور دیکھتے دیکھتے ایک کالی گھٹا کی طرح اس کی چھوٹی سی دنیا پر چھا گئی، ساری ہریالی، سارے اجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔ ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی۔ اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں، ایک روز گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ گیا جس دن باپ کے انتقال کی خبر اسے ملی ایک حسد آمیز مسرت ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اس نئی دنیا میں آکر ہری دھن کو پھر ایک مرتبہ ماں کی محبت کا مسا سکھ ملا۔ اس کی ساس نے کسی رِی بردان کی طرح اس کی بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کر دیا، اس میں ہریالی پیدا ہو گئی، سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں اس کی شفقت میں سالیوں کے مذاق میں اور بیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہو گئیں، ساس کہتی بیٹا تم اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو میری آنکھوں کے تارے ہو۔ وہ اس سے اپنے لڑکوں کی بہوؤں کی شکائیت کرتی، وہ دل میں سمجھتا تھا کہ ساس مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہے۔ باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا اور اپنے حصہ کی جائداد فروخت کر کے روپیہ کی تھیلی لئے ہوئے پھر واپس آگیا۔ اس کی دُگنی قدر و منزلت ہونے لگی اس نے اپنی ساری پونجی ساس کے چرنوں پر رکھ کر اپنے

کو خوش نصیب سمجھا. اب تک اُسے گھر کی یاد آجاتی تھی اب بھول کر بھی اس کی یاد نہ آتی تھی گو یادہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا،
وہ سب سے پہلے اٹھتا، سب سے زیادہ کام کرتا. اس کی محنت و تندہی دیکھ کر گاؤں کے لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے، اس کے خسر کی قسمت کو سراہتے جسے ایسا داماد ملا تھا. لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اس کی خاطر داری میں کمی واقع ہوتی گئی، وہ پہلے دیوتا تھا، پھر گھر کا آدمی اور بالآخر وہ گھر کا غلام ہو کر رہا، روٹیوں میں بھی خلل واقع ہوا، توہین ہونے لگی، اگر گھر کے لوگ بھوکے مرتے اور ان کے ساتھ ہی اسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی لیکن جب وہ دیکھتا کہ لوگ تو پوچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں صرف میں ہی دودھ میں مکھی بنا دیا گیا ہوں تو اس کے دل سے آہ سرد نکل جاتی ابھی وہ صرف پچیس ہی سال کا تو تھا. اتنی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی؟

اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں، اس کی مصیبت کا سب زیادہ درد ناک پہلو تھا.

(۳)

ہری دھن ادھر تو بھوکا پیاسا فکر و تشویش کی آگ میں جل رہا تھا اور ادھر مکان کے اندر ساس اور بہوؤں سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں. گمانی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی تھی بڑے سالے نے کہا. ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھر کا ٹھیکا تھوڑا ہی لیا ہے. دس سال ہو گئے ہیں اتنے دنوں میں کیا دو تین ہزار نہ کھا گئے ہوں گے؟
چھوٹا سالا بولا" مجور (مزدور) ہو تو آدمی جھڑکے بھی، ڈانٹے بھی، اب

انہیں کوئی مل گیا ہے۔ نہ جانے ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں، اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے دو ہزار روپے انہیں دے رکھے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دو ہزار روپے کب کے صاف ہو گئے۔ سوا سیر تو ایک جیو کو چاہیئے۔"

ساس نے متانت سے کہا "بھائی بھاری خوراک ہے۔"

گمانی ماں کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی" بولی نکمے آدمی کو کھانے کے سوا اور کام ہی کیا رہتا ہے۔"

بڑا سالہ "کھانے کی کوئی بات نہیں ہے، جسے جتنی بھوک ہو اتنا کھائے۔ مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہیئے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ پہنائی میں کسی کے دن کٹے ہیں۔

چھوٹا سالا "میں ایک دن کہہ دوں گا کہ آپ اپنی راہ لیجئے۔ آپ کا قرضہ نہیں کھایا ہے۔"

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سُن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی اگر وہ باہر سے چار پیسے لاتا تو اس کی گھر میں کتنی آؤ بھگت ہوتی، وہ بھی رانی بن کر رہتی، نہ جانے کیوں نہیں باہر جا کر کماتے اُن کی نانی مر گئی ہے۔

گمانی کے خیالات وجذبات ابھی طفلانہ تھے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا اسی گھر کے نفع و نقصان کا خیال اسے کبھی نہ تھا وہ بھی اسی مسئلہ کو انہیں الفاظ میں سمجھتی اور انہیں نگاہوں سے دیکھتی جیسا کہ اس کے گھر والے " پیچ تو یہ ہے دو ہزار میں کیا کسی کو مول لیں گے دس سال میں دو ہزار ہوتے ہی کیا ہیں دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے، کیا دو آدمی سال بھر میں دو سو نہ کھائیں گے، پھر کپڑے لتے گھی سبھی کچھ تو ہے۔ دس سال ہو گئے۔ ایک پیتل کا چھلا بھی نہیں بنا

گھر سے نکلتے تو جیسے اُن کے پران جاتے ہیں جیسے پہلے پوجا ہوتی تھی ویسے ہی ہوتی رہے گی یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے بہو پہلے سسرال جاتی ہے۔ تو اس کا کتنا جائم ہوتا ہے ڈولی سے اترتے ہی باجے بجتے ہیں۔ گاؤں محلہ کی عورتیں اس کا مُنہ دیکھنے آتی ہیں۔ اور روپیہ بھی دیتی ہیں۔ مہینوں اسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے، اچھا پہننے کو، کوئی کام نہیں لیا جاتا، لیکن چھ مہینے کے بعد کوئی آسا کی بات بھی نہیں پوچھتا، وہ گھر کی لونڈی ہو جاتی ہے ان کے گھر میں میری بھی تو ہی درگت ہو گی۔ پھر رونا کاہے کا جو یہ کہو کہ تو کام کرتا ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ مجوری کی اور بات ہے، آدمی ڈانٹتا بھی ہے، مارتا ہے، جب چاہتا ہے رکھتا ہے، جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے، کس کر کام لیتا ہے۔ یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے۔"

(۳)

ہری ابھی پڑا ہوا اندر ہی اندر سلگ رہا ہوگا، کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے، بڑے سب بولے "بھیا اُٹھو تیسرا پہل ڈھل گیا۔ کب تک سوتے رہو گے؟"

ہری دھن فوراً اُٹھا اور تیز لہجہ میں کہا "کیا تم دونوں نے مجھے اُلو سمجھ لیا ہے۔"

دونوں ششدر رہ گئے "جس آدمی نے کبھی زبان نہیں کھولی ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا اور آج یکا یک اتنا خوددار ہو جائے یا آستین چڑھا کر کھڑا ہو جائے۔" یہ انہیں ہوش میں لانے کے لئے کافی تھا۔ کچھ جواب نہ سوجھا۔

بری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں بس وہ ایک دھکا دینے کی زبردست خواہش کو روک نہ سکا اسی طرح بولا "میرے بھی آنکھیں ہیں اندھا نہیں ہوں نہ بہرا ہوں، چھاتی پھاڑ کر کام راہبر بھی کتا سمجھا جاؤں ایسے گدھے تمہیں اور ہوں گے۔

اب بڑے سالے صاحب بھی گرم ہو پڑے "تمہیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے"۔

بری دھن لاجواب ہو گیا کوئی بات نہ سوجھی۔

بڑے نے پھر اسی لہجہ میں کہا "اگر تم یہ چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمہارا ویسا ہی ہوتا رہے تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے"۔

بری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا "کیا میں تم لوگوں سے کم کام کرتا ہوں؟"

بڑے۔ یہ کون کہتا ہے۔

بری۔ یہ تو تمہارے گھر کی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہی بھوکوں مارا جائے۔

بڑے۔ تم خود کھانے نہیں گئے۔ کیا کوئی تمہارے منہ میں ڈال دیتا۔

بری نے ہونٹ چبا کر کہا۔ میں خود کھانے نہیں گیا کہتے تمہیں لاج نہیں آتی؟

بڑے۔ نہیں آئی تھی بہن تمہیں بلانے؟

بری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا۔ اماں بھی تو آئی تھیں تم نے کہہ دیا بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں؟

ساس بھی اندر سے لپکی آ رہی تھی دھن کر بولی "کتنا کہہ کر ہار گئی۔

کو اٹھے نہ تو میں کیا کروں؟

....

بری دھن نے زہر تول اور آگ سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا "تو میں تمہارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کیلئے ہوں، میں کہتا ہوں کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے روکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دو۔ بڑھیا نے اینٹھ کر کہا" تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کروگے؟"

بری دھن شکست کھا گیا۔ بڑھیا نے ایک جملہ کے وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں آنکھوں کی آگ مدھم پڑ گئی پھڑکتے ہوئے نتھنے ساکت ہو گئے کسی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کی طرح وہ زمین پر گر پڑا۔ کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کروگے؟ یہ جملہ ایک بھالے کی طرح اس کے دل میں چبھا جا رہا تھا۔ نہ دل کی حد تھی نہ بھالے کی انتہا۔

(۵)

کل گھر نے کھانا کھایا۔ مگر بری دھن نہ اٹھا۔ ساس نے منایا، سالیوں نے منایا خسر نے منایا۔ دونوں سالے منا کر ہار گئے مگر بری دھن نہ اٹھا۔ دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا تھا اسے اٹھا کر الگ کنوئیں پر لے گیا اور جگت پر بچھا کر پڑ رہا۔

رات زیادہ ہو چکی تھی آسمان کی فضائے بسیط میں لامحدود ستارے لڑکوں کی طرح کھیل رہے تھے کوئی ناچتا تھا، کوئی کودتا تھا۔ کوئی ہنستا تھا۔ کوئی آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں کوئی بہادر لڑکا ایک لمحہ میں اس وسیع میدان کو پار کر جاتا اور نہ جانے کہاں جا کر چھپ جاتا۔ بری کو اپنا بچپن یاد آیا۔ جب وہ اسی طرح کھیلا کرتا تھا اس کی بچپن کی یاد روشن ستاروں کی طرح چمک اٹھی وہ اس کا چھوٹا

اپنا گھر، وہ آم کا باغ جہاں کیریاں چنا کرتا تھا وہ میدان جہاں وہ کبڈی کھیلا کرتا تھا۔ سب اُسے یاد آنے لگے۔ پھر ماتا بھری ماں کی موہنی صورت اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ ان آنکھوں میں کتنا درد تھا، کتنا رحم تھا اُسے معلوم ہوا گویا ماں آنکھوں میں آنسو بھرے اسے سینے سے لگا لینے کے لئے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آ رہی ہے وہ اسی دلکش تصویر میں محو ہو کر رہ گیا۔ گویا ماں نے اس کو سینہ سے لگا لیا ہے اور وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے، وہ رونے لگا، زار و قطار رونے لگا اسی خود فراموشی کی حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اماں تم نے مجھے بھلا دیا دیکھو تمہارے پیارے لال کی کیا درگت بن رہی ہے۔ کوئی اسے پانی کو بھی نہیں پوچھتا کیا جہاں تم ہو وہاں میرے لئے جگہ نہیں ہے، دفعتاً گمانی نے آ کر پکارا سو گئے تم، چل کر کھا کیوں نہیں لیتے کب تک کوئی تمہارے لئے بیٹھا رہے؟"

ہری اُٹھ بیٹھا اور تلوار سی نیام سے نکال کر بولا "بھلا تمہیں میری سدھ آئی تو۔ میں نے تو کہدیا تھا مجھے بھوک نہیں ہے۔"

گمانی "تو کے (کتنے) دن نہ کھاؤ گے؟"

ہری۔ اس گھر کا پانی نہ پیوں گا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟

ان مصمم ارادوں سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن کر گمانی سہم اُٹھی بولی کہاں جا رہے ہو؟ ہری نے گویا نشے میں کہا تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے نہیں کہا۔

گمانی معترض لہجہ میں بولی "تم بتاتے کیوں نہیں کہاں جا رہے ہو؟"

"تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں؟"

"جب تک تم نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گی۔"

"تو یہ مجھے معلوم ہو گیا تو نہیں جانا چاہتی مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا میں

تو میں اب تک آدمی ہو کر نکل گیا ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا، گمانی "سُنو تو" پکارتی رہی مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

(۶)

تین میل کی مسافت ہری دھن نے پانچ گھنٹہ میں طے کی جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغوں کے قریب پہنچا تو اس کی ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل افق کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا، ان درختوں کو دیکھ کر اس کا دل بے قرار ناچنے لگا، مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گیا ایک جست میں وہ اوپر جا پہنچا وہ تیزی سے دوڑا جا رہا تھا گویا اس کی ماں آغوش کھولے بلا رہی ہو۔ جب وہ آموں کے باغ میں پہنچا، جہاں ڈالیوں پر بیٹھنے سے اُسے ہاتھی کی سواری کا مزہ ملتا تھا جہاں کے کچے بیر اور شہتوت میں ایک روحانی لذت تھی تو وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا، گویا ماں کو اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا تھا وہاں کی ہوا میں وہاں کی روشنی میں گویا اس کی ماں کی ایک بہت بڑی سی مورت لبس رہی تھی۔ وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے مقدس بنی ہوئی تھی ماں کی محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضا میں گونج رہے تھے وہاں کی آب و ہوا میں نہ جانے کون سا امرت تھا جس نے اس کے افسردہ دل کو ایک مرتبہ پھر اُمنگوں سے بھر دیا، وہ ایک درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ توڑ کر کھانے لگا، ساس کی وہ سخت کلامی بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت یہ سب باتیں وہ بھول گیا اس کے پاؤں پھول رہے تھے، تلوے جل رہے تھے، مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات کا خیال نہ تھا

یکایک باغ کے رکھوالے نے پکارا "یہ کون اوپر چڑھا ہوا ہے؟

اتر ابھی نہیں تو ایسا پتھر کھینچ ماروں گا کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

اس نے گالیاں بھی دیں، مگر ان گالیوں میں اس وقت ہری دھن کو بڑا لطف آرہا تھا۔ وہ ڈالیوں میں چھپ گیا۔ اس نے کئی آم کاٹ کر گرائے اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنا۔ ایسی خوشی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی۔ رکھوالے کو وہ ہنسی پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی۔ مگر ہری دھن یہاں کہاں وہ تو سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ کیا ہنسوڑ تھا، کتنا چلبلا، نہ جانے بچارے کا کیا حال ہو۔ پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑتا تھا اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟

ڈانٹ کر بولا "وہاں بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو ساری ہنسی نکال دوں گا نہیں تو سیدھے اُتر آؤ۔"

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آکر اس کے سر پر لگی۔ وہ سر سہلاتا ہوا بولا "یہ کون شیطان ہے، نہیں مانتا ٹھہر دیں آکر خبر لیتا ہوں" اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اُوپر چڑھ گیا۔ دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ متحیر ہو کر بولا "ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے؟ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے ہو؟"

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے۔

"یہاں کب آئے، چلو گھر چلو، بھلے آدمی! کیا وہاں آم بھی میسر نہ ہوتے تھے۔"

ہری دھن نے مسکرا کر کہا "منگرو ان آموں میں جو سواد اور لذت ہے اور کہیں کے آموں میں نہیں ہے۔ گاؤں کا کیا رنگ ڈھنگ ہے۔"

منگرو "سب چین ہے بھیا! تم نے تو جیسے ناتا ہی توڑ دیا اس طرح کوئی اپنا گاؤں گھر چھوڑ دیتا ہے۔ جب سے تمہارے دادا مرے ساری گرستی چوپٹ ہو

گئی اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں ان کے لئے کیا ہوتا ہے۔

ہری دھن: مجھے اب اس گرہستی سے کیا واسطہ ہے، بھائی میں تو اپنا سب دے چکا۔ مجوری تو ملے گی نا۔ تمہاری گیا دگاہیں، میں ہی چرایا کروں گا مجھے کھانے کو دے دینا۔

منگرو نے شک کے لہجہ میں کہا۔ ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو، تمہارے لئے جان تک حاضر ہے، کیا سسرال میں نہ رہو گے؟ کوئی چنتا نہیں پہلے تو تمہارا ہی گھر ہے اسے سنبھالو، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کو پالو، تم نئی اماں سے ناحق ڈرتے تھے بڑی سیدھی ہیں بچاری، بس اپنی اماں ہی سمجھو، تمہیں پاکر نہال ہو جائیں گی۔ اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے؟"

"ہری دھن۔ اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا میرے لئے وہ مر گئی"۔

"منگرو تو دوسری سگائی ہو جائے گی۔ اب کے ایسی عورت لا دوں گا کہ اس کے پیر دھو دھو کر پیو گے، پر کہیں پہلی آ گئی تو؟"

"ہری دھن۔ وہ نہ آئے گی۔"

(۷)

ہری دھن اپنے گھر پہنچا تو دونوں بھائی بھائی کہتے ہوئے اندر دوڑے گئے اور ماں کو خبر دی۔ اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہری دھن کو ایسے دلی سکون کا احساس ہوا گویا وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہی اتنے دن ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہو گیا تھا جہاں پہلے گھمنڈ تھا، ضد تھی، شیخی تھی، وہاں اب مایوسی تھی، شکست تھی اور طلب تھی۔ مرض کا زور گھٹ چلا تھا۔ اب اس پر معمولی دوا بھی اثر کر سکتی تھی، قلعہ کی دیواروں میں سوراخ ہو گئے تھے۔ اب اس میں داخل ہو جانا مشکل نہ تھا۔ وہی گھر جس سے وہ ایک

وہ دل برداشتہ خاطر ہو چکا تھا۔ اب آغوش کھولے ہوئے اُسے پناہ دینے کے لئے تیار تھا بے یارو مددگار ہری دھن اس سہارے کو پاکر بالکل مطمئن ہو گیا۔"

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا۔ "بیٹا تم گھر آ گئے ہمارا دھنیہ بھاگ اب ان بچوں کو پالو، ماں کا ناتا نہ سہی، باپ کا ناتا تو ہے، مجھے ایک روٹی دے دینا کھا کر ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔ تمہاری اماں سے تیری بہن کا ناتا ہے۔ اس ناتے سے بھی تم میرے لڑکے ہی ہوتے ہو۔"

ماں کے لئے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ہی ماں کا درشن ہوا گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا جلوہ چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہی سوتیلی ماں کے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا۔ اس کے چہرے پر خوشی تھی اور اس کی آنکھوں میں غرور تھا۔ اب وہ کسی کا سہارا لینے والا نہیں بلکہ سہارا دینے والا تھا۔ کسی کے در کا بھکاری نہیں بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا۔

ایک روز اس نے سُنا کہ گمانی نے دوسرا شوہر کر لیا، وہ ماں سے بولا "تم نے سُنا کاکی گمانی نے دوسرا گھر لیا۔

کاکی نے کہا۔ "پھر کیا کرے کی ٹھٹھا ہے برادری میں ایسا اندھیر پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔

ہری نے کہا "سہنیں کاکی بہت اچھا ہوا۔ لاؤ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں، میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے گلے نہ آ پڑے۔" بھگوان نے میری سن لی میں وہاں سے اپنے من میں ٹھان کر چلا تھا کہ اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔

قہر خدا کا

شام کو جب دینا ناتھ نے گھر آکر گوری سے کہا، "مجھے ایک دفتر میں پچاس روپے کی جگہ مل گئی ہے" تو گوری کا ایک ایک عضو شگفتہ ہو گیا۔ آنکھیں چمکیں، ہونٹ کھلے چہرہ دمک اٹھا دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور مضبوط ہو گیا ادھر ایک سال سے ان غریبوں کا برا حال تھا نہ کوئی روزی نہ روزگار گھر میں جو تھوڑے بہت گہنے پاتے تھے وہ کب کے بک چکے تھے جن دوستوں سے قرض مل سکتا تھا سب لے چکے تھے جن بنیوں سے اُدھار چیزیں مل سکتی تھیں ان سے آنکھیں چراتے تھے۔ اب یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ کئی مہینہ کا مکان کا کرایہ سر پر لدا ہوا تھا، گوالے نے تقاضہ سے تنگ آکر دودھ بند کر دیا، اور بچہ دن بھر دودھ سے بلکتا رہتا، ایک وقت کسی طرح کھانا میسر ہو جاتا تو اسے کھینچ تان کر دونوں وقت چلاتے، تقاضوں کے مارے دینا ناتھ کا گھر سے نکلنا مشکل تھا، گھر سے نکلے نہیں کہ چاروں طرف سے چنگھاڑ مچ جاتی۔ واہ بابو جی واہ دو دن کا وعدہ کرکے سودا لے گئے

اور آج دو مہینہ سے صورت نہیں دکھائی ایسے دس پانچ گاہک اور مل جائیں تو دیوالیہ ہی نکل جائے، واہ بھائی صاحب یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ اپنی ضرورتوں کا تو آپکو خیال رہے لیکن دوسروں کی ضرورت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے، دشمن کو چاہے قرض دو۔ مگر دوستوں کو کبھی مت دو قرض دیا اور دوست دشمن ہوا، دینا ناتھ کو یہ فقرے تیروں سے زیادہ لگتے تھے اور اس کا جی چاہتا کہ اس زندگی کا خاتمہ کر دے مگر بے زبان عورت اور بچے کا منہ دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ جاتا تھا۔ بارے آج ایشور نے اس پر رحم کیا اور مصیبت کے ایام کٹ گئے۔

گوری نے خوش ہو کر کہا "میں کہتی نہ تھی کہ ایشور سب کی سدھ لیتا ہے اور کبھی نہ کبھی ہماری بھی سدھ لے گا، مگر تمہیں یقین نہ آتا۔ اب تو ایشور کی رحمی کے قائل ہوئے۔

دینا ناتھ نے ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کہا: "یہ میری دوادوش کا نتیجہ ہے ایشور نے کیا کیا ایشور کو تو جب ماتا کہیں سے چھپر پھاڑ کر بھیج دیتے۔"

"ایشور جب دیتا ہے کسی نہ کسی حیلہ سے دیتا ہے سنا نہیں ہے حیلہ روزی بہانے موت۔"

"جب تک یہ دنیا کا نظام قائم ہے مجھے ایشور پر وشواش نہیں آئیگا۔"

لیکن منہ سے چاہے جو کہے اسمیں شک نہیں کہ اس کے اوسر گھر میں بھی اعتقاد کے بیج پڑ چکے تھے۔ اور اسمیں انکھوے بھی نکل آئے تھے۔

(۲)

دینا ناتھ کا آقا نہایت کج خلق آدمی تھا اور کام میں بڑا چست اس کی عمر پچاس سے زیادہ تھی اور صحت بھی رخصت ہو چکی تھی، ساگو دانہ کے سوا اور کوئی چیز ہضم نہ ہوتی

تھی پھر بھی دفتر میں سب سے زیادہ جفاکش تھا مجال نہ تھی کہ کوئی ملازم ایک منٹ کی بھی دیر کرے، یا ایک منٹ بھی وقت معین سے پہلے چلا جائے خود نہ جانے کب آتا تھا اور نہ جانے کب جاتا تھا عملے والے جب دفتر آتے تھے تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آتا جب جاتے تب بھی اپنی جگہ پر موجود رہتا لوگ اس کے سامنے جاتے ڈرتے تھے۔ گویا کاٹ کھائے گا............

...... دس منٹ تک کلیجہ مضبوط کرتے اور فراغت پاتے ہی الیسا لگتا بھاگتے گویا قید سے چھوٹے ہوں بلنے کو تو کسی کی مہلت نہ تھی ۔بس اپنی جگہ پر بیٹھے لوگ اس کی نقلیں کیا کرتے نہ جانے اس کے کتنے نئے نام رکھ لئے گئے تھے اس کی حرکات و سکنات کی تضحیک کرنا دلچسپی کا مشغلہ تھا صرف ایک بجے عملہ کو پندرہ منٹ کا وقفہ ملتا تھا جس میں جس کا جی چاہے پان کھائے ، سگریٹ پئے، یا چائے اس کے بعد ایک منٹ کا بھی موقع نہ ملتا تھا قاعدہ کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی ، اور حالانکہ تنخواہ پہلی تاریخ کو ملتی تھی تعطیلوں میں دفتر بند رہتا اور معینہ اوقات سے زیادہ ایک منٹ بھی کام نہ لیا جاتا تھا، سب کو بونس ملتا تھا اور پراویڈنٹ فنڈ کی بھی سہولیت تھی ، پھر بھی کوئی آدمی خوش نہ تھا ۔کام کی کثرت سے یا پابندی اوقات کی کسی کو شکایت نہ تھی شکایت تھی صرف مالک کے بقول تھیچڑ کی کتنا دل لگا کر کام کرو، جان بھی کیوں نہ دے دو، شکریہ کا لفظ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی اس شخص کے منہ سے نہ نکلتا . مگر اور لوگ چاہے کتنے ہی شاکی ہوں ، دینا ناتھ کو مالک سے کوئی شکایت نہ تھی، اس فاقہ کشی کے مقابلہ میں اس روکھے پن یا ترش روئی کی حقیقت تھی وہ گھڑکیاں اور پھٹکار پاکر شدید حرف شکایت زبان پر نہ لاتا، تضحیک و تفضیح میں بھی وہ شریک ہوتا، احسان سے اس کا ایک ایک رواں گراں بار ہو رہا تھا۔ سال بھر میں ہی اپنی کفایت شعاری کی بدولت اس نے قرضے چکا دیئے اور... کچھ پس انداز بھی کر لیا وہ ان لوگوں میں تھا جو تھوڑے

میں بھی خوش رہ سکتے ہیں، اگر معین وقت پر بلب جلائے۔ چار روپے روز میں وہ برکت ہوتی جو پچاس روپے ماہوار میں تھی، ضروری مصارف کی مدیں قائم ہو گئی تھیں، زندگی کی ایک لکیر بن گئی تھی اور اس پر وہ آنکھیں بند کر کے بے کھٹکے چلا جاتا تھا غیر معین آمدنی میں وہ بجٹ کیسے بناتا، کیسے اس کی پابندی کرتا، کبھی ایک چیز آتی تو دوسری چیز کم پڑ جاتی دوسری آتی تو تیسری کا رونا ہوتا، کمرے میں مستقل روشنی چاہیے دھندلی ہو اس بجلی کے لیمپ سے بہتر ہے جو کبھی جلے اور کبھی بجھ جائے۔ کبھی ہنسی ہنسا، کبھی مٹھی بھر جیا والی زندگی اُسے مطلق پسند نہ تھی۔ مقررہ خرچ کے علاوہ ایک روپیہ بھی کسی خاص کام کے لئے خرچ کرنا پڑتا تو میاں بیوی میں گھنٹوں بحث و تمحیص ہوتی اور بڑی جھاؤں جھاؤں کے بعد کہیں منظوری ملتی تھی، بل گوری کی طرف سے پیش ہوتا گوری اس کا بخیہ ادھیڑتی، بل کو پاس کرا لینا مجوز کی لیاقت اور وکالت پر منحصر تھا۔ مرثیغائی کرنے والی کوئی تیسری طاقت نہ تھی۔

دینا ناتھ اب ایکا خدا پرست بن گیا تھا۔ ایشور کے رحم و انصاف میں اب اُسے کوئی شک نہ تھا، روز سندھیا کرتا اور رامائن گیتا پڑھتا ایک دن اس کے منکر دوست نے جب ایشور کی مذمت کی تو اس نے کہا بھائی صاحب اس کا تو آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ایشور ہے یا نہیں، منکر اور موحد دونوں کے پاس فولاد کی سی دلیلیں موجود ہیں، لیکن میرے خیال میں موحد ہو کر رہنا منکر رہنے سے کہیں زیادہ مصلحت آمیز ہے اگر ایشور کا وجود ہے تو منکروں کو دوزخ کے سوا اور کہیں کا ٹھکانہ نہیں، موحد کے دونوں ہاتھ میں لڈو ہیں۔ ایشور ہے تب تو پوچھنا ہی کیا ہے، اس کے لئے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے ایشور نہیں تب بھی اس کا کیا بگڑتا ہے، دو چار منٹ کا وقت ہی تو جاتا ہے، منکر دوست اس کی دو رخی دلیل پر منہ بنا کر چلا گیا۔ ایسوں کے لئے اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا

دیوالی کا دن تھا، گوری نے اب کے ایک ہزار چراغ جلانے کا بندوبست

گیا دس سیر تیل لیا اور سارے دن بیٹھی بتیاں بناتی رہی شام کو جب دینا ناتھ دفتر سے آئے اور یہ تیاریاں دیکھیں تو چیں بہ جبیں ہو کر بولے "تمہیں بھی سنک سوار ہو گئی ہے یہ پیش کرنے سے پہلے ہی عملدر آمد شروع کر دیا۔ اتنا تیل جلانے سے فائدہ؟ آٹھ آنے کے تیل میں کام نہ چل سکتا تھا؟" گوری مسکراتی ہوئی بولی۔ اسے کبھی غصہ نہ آتا تھا "کام نہ چل سکتا تھا پچھلے سال تو دھیلے کا تیل بھی نہ آیا۔ کیا تب کام نہ چلا؟

میں یہ تو نہیں کہتا کہ تیل لیا ہی کیوں، یہی کہتا ہوں کہ اتنا زیادہ تیل کیوں لیا یہ فضول خرچی ہے۔"

"میرا دل آج فضول خرچی پر ہی مائل ہے، سوچو ایک دن وہ تھا کہ دیوالی کے دن گھر میں اندھیرا پڑا رہا۔ ایک دن آج ہے کہ ہم ایک ہزار چراغ جلانے کے لائق ہیں! کیا جب بھگوان نے ہنسنے کا موقع دیا ہے، تب بھی روتے جائیں۔ یہ کتنی بڑی ..... ناشکری ہے۔

"اچھا یہ خیال ہے، تب ضرور جلاؤ" تمہارا اپیل پاس ہو گیا۔

ایک دن دینا ناتھ شام کو دفتر چلے گئے، تو سیٹھ جی نے انہیں اپنے کمرے میں بلا بھیجا اور بڑی خاطر سے کرسی پر بٹھا کر بولے "تمہیں یہاں کام کرتے کتنے دن ہو گئے۔ سال تو ہو گیا ہوگا" دینا ناتھ نے ادب سے کہا "جی ہاں تیرھواں مہینہ چل رہا ہے۔"

"آرام سے بیٹھو۔ اس وقت گھر جا کر کچھ چائے وائے پیتے ہو؟"

"جی نہیں میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔"

"پان وان تو کھاتے ہی ہو گے جوان آدمی ہو کر ابھی سے اتنا پرہیز" یہ کہہ کر سیٹھ جی نے گھنٹی بجائی اور اردلی سے پان اور کچھ مٹھائیاں لانے کو کہا۔ دینا ناتھ برابر انکار ہی کرتا رہا، اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آج غیر معمولی خاطر داری کیوں ہو رہی ہے، کہاں تو حضرت سلام ہی نہ لیتے تھے کہاں آج مٹھائیاں اور پان سبھی کچھ منگایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میری خدمات سے خوش ہو گئے ہیں اس خیال

سے انہیں اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا۔ لعد الشعور کی یاد آ گئی۔ یہ مانتا ہوں حاضر دماغ ہے
ورنہ مجھے کون پوچھتا۔ دفتر میں میرا عہدہ بھی تو اونچا نہیں۔
اردلی پان اور مٹھائیاں لایا۔ دینا ناتھ اصرار سے مجبور ہو کر مٹھائیاں
کھانے لگا۔
سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے کہا "تم نے مجھے بہت خشک اور بے
مروت پایا ہوگا میرے ملازموں کو مجھ سے یہ عام شکایت ہے مگر میں مجبور ہوں۔ ہمارے
یہاں ابھی لوگوں میں اپنی ذمہ داری کا اتنا کم احساس ہے کہ افسر ذرا بھی نرم پڑ جائے تو
لوگ اس کی شرافت اور انسانیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں اور اپنے کام سے
بے توجہی کرنے لگتے ہیں۔ انہیں اپنے کام کی اتنی پرواہ نہیں رہتی جتنی اپنے افسر کی خوشامد اور
مصاحبت کی کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نوکروں سے میل جول بھی رکھتے ہیں، ان
سے ہنستے بولتے بھی ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شریک بھی ہوتے ہیں پھر بھی نوکروں کو ان سے
زیادہ بے تکلف ہونے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اور بھی تندہی سے اپنا کام کرتے ہیں
مالک سے انہیں ہمدردی ہو جاتی ہے۔ میں ایسا خوش نصیب نہیں ہوں، مجھ میں وہ فن
نہیں ہے۔ اس لئے میں اپنے آدمیوں سے کھنچے رہنے ہی میں خیریت سمجھتا ہوں اور
اب تک اس طرز عمل سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن آدمیوں سے علیحدہ رہ کر بھی
ان کے ...... رنگ ڈھنگ دیکھتا رہتا ہوں اور ان کی فطرت کا امتحان لیا کرتا
ہوں۔ میں نے اب تک تمہارے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ تم وفادار اور
با اصول آدمی ہو۔ اور میں تمہارے اوپر اعتبار کر سکتا ہوں، اس لئے میں تمہیں زیادہ ذمہ
داری کا کام دینا چاہتا ہوں جہاں تمہیں خود بہت کم کام کرنا پڑے گا، صرف نگرانی کرنا پڑے
گی۔ تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور اختیارات بڑھ جائیں گے۔
مجھے یقین ہے کہ اب تک جس تندہی سے تم نے کام کیا ہے، آئندہ اس سے بھی زیادہ

توجہ اور خلوص سے اپنا کام کرو گے:"

دینا ناتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حلق کی مٹھائی کچھ نمکین ہو گئی۔ جی میں آیا آقا کے قدموں پر سر رکھ دے اور عرض کرے آپ کی خدمت کے لئے میری جان حاضر ہے۔ آپ نے جو میری عزت افزائی کی ہے اور مجھ پر اعتبار کیا ہے میں اس کے لائق بننے کی کوشش کروں گا! آواز قابو میں نہ تھی، جذبات اس پر حاوی ہو گئے تھے۔ صرف احسان مند نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ مگر ان خاموش نظروں نے جتنا اظہار کیا شاید وفاداری اور تشکر کے مرصع الفاظ نے نہ کیا ہوتا، تب سیٹھ جی نے ضخیم لیجر نکال کر اس کے اوراق الٹتے ہوئے کہا۔ میں ایک ایسے کام میں تمہاری مدد چاہتا ہوں جس پر اس کاروبار کا سارا مستقبل لٹکا ہوا ہے۔ اتنے آدمیوں میں میں نے تمہیں کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گے۔ یہ سال گزشتہ کا لیجر ہے اور اس میں کچھ ایسے اندراجات ہیں جن کے مطابق کمپنی کو کئی لاکھ نفع نقصان ہوتا ہے لیکن حقیقت حال سے تم واقف ہو۔ ہم کئی مہینوں سے خسارہ اٹھا رہے ہیں جس نے یہ لیجر لکھا تھا اس کی تحریر تمہاری تحریر سے بالکل ملتی ہے، اگر دونوں تحریریں آمنے سامنے رکھ دی جائیں تو کسی ماہر فن کو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان اعداد کے مطابق ایک نیا صفحہ لکھو اور اس صفحہ کو لیجر سے نکال کر نیا ورق چسپاں کر دو۔ میں نے صفحہ کا نمبر چھپا لیا ہے۔ ایک باہر کا دفتری بھی ٹھیک کر لیا ہے جو راتوں رات شیرازہ بندی کر دے گا۔ کسی کو پتہ نہ چلے گا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ تم وہ نیا صفحہ ان اعداد کے مطابق نقل کر دو۔

دینا ناتھ نے اس تجویز کے خطرہ سے متاثر ہو کر کہا "اگر انہیں اعداد کی نقل کرنا ہے تو نیا صفحہ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

سیٹھ جی اس کی سادگی پر ہنس کر بولے "تم کیا سمجھتے ہو اس صفحہ کی

بجنسہ نقل کرنی ہوگی میں کچھ نئے اعداد دوں گا جنہیں تم نشان کردہ رقموں کی جگہ درج کر دو گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں محض اس دفتر کی بہتری کے خیال سے یہ کارروائی کر رہا ہوں، اگر یہ ردّ و بدل نہ کیا گیا تو اس دفتر کے سو آدمیوں کی روزی خطرے میں پڑ جائے گی یہاں کچھ پس و پیش کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ ایک سو ملازمین اور کم سے کم پانچ سو مزدوروں کی روٹیوں کا معاملہ ہے، تم بہت زود نویس ہو اور تمہارے لئے یہ محض آدھ گھنٹہ کا کام ہے۔

بڑا مشکل مسئلہ تھا، یہ ظاہر تھا کہ اسے صریح جعل سازی کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے، اس کے پاس اس حقیقت کو دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ سیٹھ جی نے جو تجویز پیش کی ہے اس میں ان کی ذاتی غرض شامل ہے یا صرف دفتر کے آدمیوں کی بہتری کا خیال ہے لیکن بہرحال یہ تحریف اور تلبیس تو کیا وہ ذاتی نفع کیلئے بھی اپنے ضمیر کا خون کرے گا، نہیں ہرگز نہیں۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "آپ مجھے معاف کریں، میں یہ خدمت نہ بجا لا سکوں گا میں اپنے اصول کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

سیٹھ جی کو مطلق غصہ نہیں آیا۔ اُسی سکون آمیز تبسم کے ساتھ بولے

"کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ سراسر جعل ہے۔"

"جعل کسے کہتے ہیں؟"

"نقل کو اصل بنا کر دکھانا جعل نہیں تو اور کیا ہے؟"

لیکن اگر اس تغیر سے سو آدمیوں کی روزی بنی رہے تو اس حالت میں بھی یہ جعل ہے کمپنی کی اصلی حالت کچھ ہے کاغذی حالت کچھ ہے، اگر تغیر نہ کیا جائے تو فوراً کئی لاکھ روپے کے نقصے دینے پڑ جائیں گے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کا دیوالہ نکل جائے گا اور

یہ سارے آدمی بیکار ہو جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تھوڑے سے مالدار حصہ داروں کے لئے اتنے غریبوں کا خون کیا جائے غریبوں کی بہتری کے لئے اگر کچھ جعل بھی کرنا پڑے تو میں اسے ضمیر کا خون نہیں سمجھتا۔ اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی آدمی کی جان بچتی ہو تو مجھے جھوٹ بولنے میں مطلق تامل نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے ساتھ تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے۔

دینا ناتھ کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اگر سیٹھ جی کا قول صحیح ہے اور اس تحریف سے ایک سو آدمیوں کی روزی قائم رہ سکتی ہے تو اسے جعل کرنا پڑے گا۔ یہ جعل نہیں ناگوار فرض ہے۔ اگر ضمیر کا خون بھی ہوتا ہے تو اتنے آدمیوں کی بہتری کے لئے اس کا خون بھی کرنا پڑے گا۔ لیکن ضمیر کو سمجھا لینے کے بعد اسے اپنے مواخذہ کا خیال آیا قانون کی نظر میں جعل جعل ہے خواہ کسی نیت سے بھی کیا جائے......

بولا۔ "لیکن یہ راز کھل گیا تو مجھے چودہ سال کالا پانی ہوا رکھا ہے"

سیٹھ جی نے زور سے قہقہہ مارا۔ "اگر راز کھل گیا تو تم نہ پھنسو گے میں پھنسوں گا تم صاف انکار کر سکتے ہو"۔

"تحریر میں کچھ کچھ امتیاز تو رہے گا"۔

"پتہ ہی کیسے چلے گا کہ کونسا صفحہ بدلا گیا ہے اگر تحریروں میں کچھ امتیاز ہے بھی تو ناقابل احساس"

دینا ناتھ لاجواب ہو گیا۔ اسی وقت صفحہ کو نئے اعداد کے مطابق لکھنے لگا۔

پھر بھی دینا ناتھ کے دل میں چور بیٹھا ہوا تھا۔ گوری کو اس نے شریک راز نہ کیا۔

ایک مہینے بعد اس کی ترقی ہو گئی۔ سو روپے ملنے لگے، دو سو بونس کے بھی ملے۔ یہ سب کچھ ہوا۔ گھر میں فارغ البالی کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن دینا ناتھ کا مجرم ضمیر ایک بوجھ سے دبا رہتا تھا۔ جن دلیلوں سے سیٹھ جی نے اس کی زبان بند کی تھی۔ ان دلیلوں سے گوری کی زبان بند کر سکنے کا یقین اسے نہ تھا۔ اب خود اسے ان دلیلوں کا اصلی پہلو نظر آنے لگا تھا۔ اس کی خدا پرستی، روحانی تقویت کے بدلے اُسے پاگل کرتی رہتی تھی، قہر الٰہی کا خوف اس کے دل میں سمایا رہتا تھا۔ اس گناہ کی سزا ضرور ملے گی کبھی تو یہ، کسی کفارہ سے وہ اس سزا سے بچ نہیں سکتا۔ ابھی نہ ملے، سال دو سال نہ ملے، دس پانچ سال نہ ملے لیکن جتنی ہی دیر میں ملے گی اتنی ہی خوفناک ہوگی۔ زر اصل سود کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔ وہ اکثر پچھتاتا تھا میں سیٹھ جی کی ترغیب میں کیوں آ گیا۔ کارخانہ ٹوٹتا یا رہتا میری بلا سے۔ مجھے یہ روحانی خلش نہ ہوتی لیکن اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور سزا ضرور ملے گی۔ اس خوف سے اس کا سکون قلب اس کی طبعی بشاشت اُس کی زندہ دلی رخصت ہو گئی وہ اب گنہگار تھا جس کا فرد جرم جلی حرفوں میں اس کی نظروں کے سامنے لٹکتا رہتا تھا، وہ ایک پل بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر سکتا تھا۔

ملیریا پھیلا ہوا تھا، بچے کو بخار آنے لگا۔ دینا ناتھ کی جان ناخن میں سما گئی۔ کہاں جائے، کیا کرے جیسے عقل سلب ہو گئی ہو۔

گوری نے کہا جا کر کوئی دوا لاؤ۔ کسی ڈاکٹر کو دکھا دو۔ تین دن تو ہو گئے۔"

دینا ناتھ نے تشویشناک انداز سے جواب دیا "ہاں جاتا ہوں" لیکن مجھے بڑا اندیشہ ہو رہا ہے۔"

"اندیشہ کی کون بات ہے۔ بے بات کی بات منہ سے نکالتے ہو

آج کل کیسے بخار نہیں آتا؟

"ایشور اتنا بے رحم کیوں ہے؟"

"ایشور بے رحم ہے گنہگاروں کے لئے۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"کیا ایشور گنہگاروں کو بھی معاف نہیں کرتا؟"

"گنہگاروں کو سزا نہ ملے تو دنیا میں کوئی زندہ نہ رہنے پائے۔"

"لیکن آدمی ایسے کام بھی تو کرتا ہے جو ایک خیال سے گناہ ہو سکتے ہیں، دوسرے خیال سے عین ثواب۔"

"میں نہیں سمجھتی۔"

"ان کو میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہو تو وہ گناہ ہے؟"

"میں سمجھتی ہوں ایسا جھوٹ ثواب ہے۔"

دیناناتھ کو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو گیا، ڈاکٹر بلا لیا۔ علاج شروع کیا ایک ہفتہ میں بچہ بھلا چنگا ہو گیا۔

مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ خود بیمار پڑا۔ اب کے ضرور اس پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے۔ اور وہ جانبر نہیں ہو سکتا۔ معمولی فصلی بخار تھا، لیکن دیناناتھ کے خوف سزا نے اُسے سرسام کی صورت دے دی، بخار میں حالت نشہ کی طرح یوں ہی واہمہ بہت بلند پرواز ہو جایا کرتا ہے پہلے جو محض ایک وہم تھا وہ مکمل حقیقت بن بیٹھا۔ تخیل نے موت کے فرشتے بنا کر کھڑے کر دیئے۔ اُن کے بھالے اور کوہ گرز ڈھیلے، دوزخ کے اگن کنڈ دکھا دیئے ڈاکٹر کی ایک گھونٹ دوا ایک ایک جرعہ گرز کی چوٹ اور آگ کے ابلتے ہوئے سمندر کی علامت پیدا کیا کرتی۔ دیناناتھ وہم پرست نہ تھا پرانوں کے دوراز قیاس مقولوں پر اسے مطلق ایمان نہ تھا۔ وہ معقولات کا دلدادہ تھا اور خدا پر بھی اسے اسی وقت یقین آیا جب اس کی عقل

نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا، لیکن ایشور آیا تو اس کے ساتھ رحم بھی آیا قہر بھی آیا رحم کی بدولت اُسے روزی ملی خدا کا رحم نہ ہوتا تو شاید وہ بھوکوں مر جاتا، لیکن رحم کی صورت کتنی کمزور اور حقیر ہے۔ قہر کی صورت کتنی ہیبت ناک، بھوکوں مر جانا، آگ کنڈ میں دھکیل دیئے جانے کی نسبت کتنا آسان ہے، بالکل کھیل ہے۔ سزا کا تخیل بزرگوں سے متوارث ہوتے ہوتے اتنا راسخ ہو گیا تھا گویا اس کی روح اور عقل کا ایک جزو ہو گیا ہو، اس کا اندرونی اس کے چھپے ہوئے تاثرات پر سمندر کی اونچی لہروں کی طرح آتا تھا اور انہیں ایک لمحے کیلئے غرقاب کر کے پھر لوٹ جاتا تھا اور پہاڑ جوں کا توں کھڑا رہ جاتا تھا۔

زندگی باقی تھی بچ گئی، طاقت آتے ہی وہ قہر جانے لگا۔

ایکسون گوری بولی، جب تم بیمار تھے تو ایک دن تمہاری حالت نازک ہو گئی تھی اور میں نے گھبرا کر بھگوان سے منوتی کی تھی کہ اگر یہ اچھے ہو جائیں تو پچاس براہمنوں کو بھوجن کراؤں گی۔ دوسرے دن ہی تمہاری حالت سنبھلنے لگی ایشور نے میری عرض سن لی۔ آج بازار سے سامان لا دو تو وہ مانتا پوری کر دوں بچاس برہمنوں کو نوتہ دو گے تو سو دو سو آ جائیں گے، بچاس کنبے ہی سمجھ لو اور دوستوں میں بھی پچیس تو نکل ہی آئیں گے، دو سو آدمیوں کا تخمینہ ہے۔ میں جنس کی مقدار لکھے دیتی ہوں۔

دینا ناتھ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا "تو تمہارا خیال ہے میں ایشور کے رحم سے اچھا ہو گیا؟"

"اور کیسے اچھے ہوئے؟"

"اچھا ہوا اس لئے کہ زندگی باقی تھی؟"

"ایسی باتیں نہ کرو مانتا پوری کرنی ہو گی"

"ہرگز نہیں، میں بھگوان کو رحیم نہیں سمجھتا۔"

"اور کیا بھگوان بے رحم اور ظالم ہے؟"

"اس سے زیادہ اور کیا بیرحم اور سنگدل ہستی دُنیا میں نہ ہوگی جو اپنے بنائے ہوئے کھلونوں کو ان کی غلطیوں اور حماقتوں کی سزا یہ دے کہ انہیں دوزخ کے آگ کے کنڈ میں دھکیل دے۔ وہ بھگوان رحیم نہیں ہو سکتا! ایسے بھگوان کے تخیل سے ہی میری روح کو لرزہ آتا ہے۔ محبت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت کہی گئی ہے۔ عقلمندوں نے محبت ہی کو زندگی کی اور دُنیا کی علت قرار دیا ہے۔ عبادت میں نہ سہی تخیل ہی سہی، محبت میں ہماری زندگی کی حقیقت ہے۔ مگر تمہارا ایشور اپنے قہر اور عذاب کے خوف سے دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ پھر اس میں اور معمولی انسان میں کیا فرق ہوا۔ ایسے ایشور کی عبادت میں نہیں کرنا چاہتا، نہیں کر سکتا۔ جو لوگ موٹے ہیں ان کیلئے رحیم ہوگا، کیونکہ وہ دُنیا کو اسی کی رحیمی کی بدولت لوٹتے ہیں، ہم جیسوں کو تو ایشور کی یاد کہیں نظر نہیں آتی ہاں اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھورا کرتا ہے، یہ مت کرو، نہیں ایشور تمہیں سزا دے گا، وہ مت کرو نہیں دوزخ میں جاؤ گے، ایسے ایشور سے کم از کم مجھے عقیدت نہیں ہو سکتی، محبت سے حکومت کرنا انسانیت ہے۔ خوف سے حکومت کرنا بربریت ہے۔ ایسے قہار و جبار خدا سے تو خدا کا نہ ہونا نہیں کہیں اچھا ہے۔ اسے دل نکال کر میں اُسکے رحم اور اُسکے قہر دونوں ہی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ ایک کلمہ سخت ریموں کے پریم کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ میں تمہارے اوپر برابر جان دیتا رہتا ہوں لیکن کسی دن ایک طعنہ دو تو میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کرو گی ایسی پُر عذاب پُر خوف زندگی کیلئے میں کسی ایشور کا احسان نہیں لینا چاہتا۔ اگر تم نے براہمنوں کے بوجھ پر زور دیا تو میں زہر کھا لوں گا۔"

گوری اُسکے چہرہ کیطرف خوفزدہ نظروں سے تکتی رہ گئی۔

فریب

دنیا میں اگر کوئی شخص ایسا ہوتا جس کی نگاہ لوگوں کے دلوں میں اندر گھس سکتی تو ایسے بہت کم لوگ ہوتے جو اس کے سامنے سیدھی آنکھیں کر کے دیکھ سکتے، مہلا آشرم کی جگنو بائی کے متعلق لوگوں کو ایسی ہی نگاہ رکھنے کا گمان تھا۔ وہ ناخواندہ غریب بوڑھی عورت تھی مسکین عورت لیکن جیسے کسی ہوشیار پروف ریڈر کی نگاہ غلطیوں پر ہی جا پڑتی ہے اس کی آنکھیں بھی باطن کے داغوں پر جا پڑتی تھیں۔ شہر میں ایسی کوئی سربرآوردہ خاتون نہ تھی جس کے متعلق دو چار راز کی باتیں اُسے نہ معلوم ہوں۔ اس کا پست قد، نحیف جسم سفید بال اور پر شکن چہرہ اُس کی جانب سے حسن ظن پیدا کرتے تھے مہلائیں اسے اپنا کرم راز بنا لیتی تھیں۔ اور ہمیشہ کیلئے اس کے دام میں پھنس جاتی تھیں جس پر وہ ایک بار قابو پا لیتی اس پر سختی سے حکومت

کرتی۔ اس کا کام مہیلا آشرم میں عورت کی خدمت تو اقع کرنا تھا جس میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو، لیکن دیویاں اس کی صورت سے کانپتی تھیں، اس کا ایسا رعب تھا...

...کہ جوں ہی وہ کمرے میں قدم رکھتی لبوں پر آئی ہوئی ہنسی جیسے رو پڑتی تھی۔ چہکنے والی آوازیں خاموش ہو جاتی تھیں، گویا اس کے چہرے پہ دیویوں کو اپنے پچھلے کارناموں کو کسی خونخوار درندے کی طرح پنجرے میں بند کر کے نہ رکھنا چاہتا ہو، وہ راز جو پہلے ایک کیڑے کی طرح حقیر اور کم بضاعت تھا، دونوں کے ساتھ مجسم اور خوفناک ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ ہم اس کی یاد ہی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ اور اگر اپنے ہی کارناموں کی بات ہوتی تو زیادہ تر عورتیں جگنو سے اجتناب کرتیں مگر یہاں تو سسرال اور ننھیال چاروں طرف کی حفاظت کرنا پڑتی اور جس قلعہ میں اس قدر دروازے ہوں اس کی حفاظت کون کر سکتا ہے وہاں تو حملہ آور کے سامنے سر جھکا دینے میں ہی خیریت ہے جگنو کے دل میں ہزاروں مردے دفن تھے جب ضرورت پڑتی اکھاڑ لیتی، جہاں کسی عورت نے دم دن کی لی یا شان دکھلائی دیکھ جگنو کی تیوریاں بدلیں اس کی کڑی نگاہ اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیا کرتی تھی گر مستورات اس سے نفرت کرتی ہوں یہ بات نہ تھی سبھی بڑے چاؤ سے اس سے ملتیں اور اس طرح آؤ بھگت کرتیں۔ اپنے ہمسایوں کی بدنامی ہمیشہ لوگوں کو دلچسپی کا سامان ہی رہا ہے اور جگنو کے پاس اس کی کمی نہ تھی۔

(۲)

شہر میں اندومتی مہیلا پاٹھ شالا کا نام ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا، حال میں مس خورشید اس کی ہیڈ مسٹرس ہو کر آئی تھیں، شہر میں مستورات کا دوسرا کلب نہ تھا مس خورشید ایک دن آشرم میں تشریف لائیں، ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ کوئی دوسری

عورت آشرم میں نہ تھی ان کی بڑی مدارات ہوئی پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ مس خورشید کی آمد سے آشرم میں جان سی پڑ گئی تھی۔ کچھ اس طرح دل کھول کر ہر ایک سے ملیں، کچھ ایسی دلچسپ باتیں کہیں کہ تمام عورتیں فریفتہ ہو گئیں۔ گانے میں ہوشیار تھیں، تقریر بھی خوب کرتی تھیں اور ناٹک کے پارٹ ادا کرنے میں تو انہوں نے لندن میں خاص نام پیدا کیا تھا ایسی ہمہ صفت موصوف خاتون کی آمد آشرم کی خوش قسمتی تھی، گلابی رنگ نازک اندام، نرگسی آنکھیں نئے فیشن کے کٹے ہوئے بال، ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا خوبصورتی کی اس سے اچھی تصویر کسی نے کم دیکھی ہوگی۔

چلتے وقت مس خورشید نے مسز ٹنڈن سے جو آشرم کی انچارج تھیں بلا کر پوچھا "وہ بڑھیا کون ہے؟"

جگنو کئی دفعہ کمرے میں آکر مس خورشید کو تجسس نگاہوں سے دیکھ چکی تھی، جیسے کوئی شہسوار نئی گھوڑی کو دیکھ رہا ہو۔

مسز ٹنڈن نے مسکرا کر جواب دیا "یہ اوپر کا کام کرنے پر نوکر ہے کوئی کام ہو تو بلاؤں۔"

مس خورشید نے شکریہ ادا کرتے کہا "جی نہیں کوئی خاص کام نہیں ہے مجھے چالباز معلوم ہوتی ہے، یہ بھی دیکھ رہی ہوں۔ یہاں پر وہ نوکر نہیں مالکہ ہے۔"

مسز ٹنڈن تو جگنو سے جلی بیٹھی تھیں، اب تو ہو گی کا داغ لگانے کے لئے وہ سدا سہاگن کہا کرتی تھیں۔ مس خورشید سے اس کی جتنی برائی ہو سکی وہ کی اور اسے خبردار رہنے کا مشورہ دیا۔

مس خورشید نے سنجیدگی سے کہا "تب تو خوفناک عورت ہے۔ جبھی سبھی عورتیں اس سے کانپتی ہیں۔ آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتیں ایسی چڑیل کو ایک دن بھی نہ رکھنا چاہیئے۔"

مسز ٹنڈن نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ نکال کیسے دوں، زندگی مشکل ہو جائے۔ ہماری قسمت اس کی مٹھی میں ہے آپ پردہ چار دنوں میں اس کے جوہر کھلیں گے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہیں آپ بھی اس کے پنجے میں نہ پھنس جائیں اس کے سامنے بھول کر بھی کسی مرد سے بات نہ کیجئے گا۔ اس کے پنجے نہ جانے کہاں کہاں لگے ہوئے ہیں نوکروں سے مل کر بھید یہ لے۔ ڈاکیوں سے مل کر خط یہ دیکھے، لڑکیوں کو پھسلا کر گھر کا حال یہ پوچھے۔ اس ماند کو تو خفیہ پولیس میں بھرتی ہونا چاہیے تھا یہاں نہ جانے کیوں آمری"

مس خورشید فکر میں ڈوب گئی، گویا اس عقیدہ کے حل کرنے کی ترکیب سوچ رہی ہو۔ ایک لمحہ بعد بولیں "اچھا میں اسے ٹھیک کر دوں گی"۔

مسز ٹنڈن۔ نکال دینے سے کیا ہو گا، اس کی زبان تو بند نہ ہو گی۔ تب اور بھی نڈر ہو کر کیچڑ اچھالے گی"۔

مس خورشید نے اطمینان کے لہجہ میں کہا "میں اس کی زبان بھی بند کر دوں گی بہن آپ دیکھ لیجئے گا۔ کیا عورت یہاں راج کر رہی ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔

وہ چلی گئیں تو مسز ٹنڈن نے جگنو کو بلا کر کہا "ان نئی مس صاحبہ کو دیکھا یہاں پرنسپل ہیں"۔

جگنو نے بغض سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا "آپ دیکھیں، میں ایسی سینکڑوں چھوکریاں دیکھ چکی ہوں۔ آنکھ کا پانی جیسے مر گیا ہو"۔

مسز ٹنڈن "آہستہ بولو۔ تمہیں کچا ہی چبا جائیں گی۔ ان سے ڈرتی رہنا، کہہ گئی ہیں میں اسے ٹھیک کر کے چھوڑوں گی۔ میں نے سوچا تمہیں خبردار کر دوں، ایسا نہ ہو اس کے سامنے کچھ ایسی ویسی بات کہہ بیٹھو"

جگنو نے گویا تلوار کھینچ کر کہا "مجھے خبردار رہنے کی ضرورت نہیں، انہیں خبردار کر دیجئے گا یہاں آنا نہ بند کر دوں تو اپنے باپ کی نہیں، وہ گھوم کر دنیا دیکھ آئی ہوں تو یہاں گھر بیٹھے بیٹھے دنیا دیکھ چکی ہوں۔"

مسز ٹنڈن نے پیٹھ ٹھونکی "میں نے سمجھا دیا بھئی آگے تم جانو تمہارا کام۔"

جگنو "آپ چپ چاپ دیکھتی جائیے۔ کیا نکنی کا ناچ نچاتی ہوں۔ اس نے اب تک بیاہ کیوں نہیں کیا؟ عمر تیس کے لگ بھگ ہو گی۔"

مسز ٹنڈن نے رد جمایا "کہتی ہیں، میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ کسی مرد کے ہاتھوں میں اپنی آزادی کیوں بیچوں۔"

جگنو نے آنکھ نچا کر کہا "کوئی پوچھتا ہی نہ ہو گا ایسی بہت سی کنواریاں دیکھ چکی ہوں، ستر چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔"

اتنے میں اور کئی مستورات آگئیں اور بات کا سلسلہ بند ہو گیا۔

(۳)

دوسرے دن جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر پہنچی، اتفاق سے مس خورشید ہوا کھانے کو گئی ہوئی تھیں، خانساماں نے پوچھا "کہاں سے آئی ہو؟"

جگنو "یہیں رہتی ہوں بیٹا، میم صاحبہ کہاں سے آئی ہیں۔ تم تو ان کے پرانے نوکر ہو گے۔"

خانساماں "ناگپور سے آئی ہیں، میرا گھر بھی ہے دس سال سے ان کے ساتھ ہوں۔"

جگنو "کسی اونچے خاندان کی ہوں گی وہ تو رنگ ڈھنگ سے ہی معلوم ہوتا ہے۔"

خانساماں۔ خاندان تو کچھ ایسا اونچا نہیں ہے۔ ہاں تقدیر کی اچھی ہیں۔ ان کی ماں ابھی تک مشن میں تیس روپے پاتی ہیں۔ یہ پڑھنے میں تیز تھیں۔ وظیفہ مل گیا۔ ولایت چلی گئیں۔ بس تقدیر کھل گئی۔ اب تو اپنی ماں کو بلانے والی ہیں۔ لیکن وہ بڑھیا شاید ہی آوے۔ یہ گرجے وجے نہیں جاتیں۔ اس دونوں میں پٹتی نہیں۔"

"ٹھگنو۔ مزاج کی تیز معلوم ہوتی ہیں؟"

خانساماں۔ نہیں مائی بہت نیک ہیں۔ ہاں گرجے نہیں جاتیں تم کیا نوکری کی تلاش میں ہو۔ کرنا چاہتی ہو تو کر لو ایک آیا رکھنا چاہتی ہیں۔"

ٹھگنو۔ نہیں بیٹا اب میں نوکری کیا کروں گی۔ اس بنگلہ میں پہلے جو میم صاحبہ رہتی تھیں وہ مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ میں نے سمجھا چلو نئی میم صاحبہ کو دعا دے آؤں۔

خانساماں "یہ دعا دینے والی میم صاحبہ نہیں ہیں۔ ایسوں سے بہت چڑتی ہیں کوئی مانگنے والا آیا اور اسے ڈانٹ بتائی۔ کہتی ہیں بنا کام کئے کسی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ بھلا چاہتی ہو تو چپکے سے راہ لو۔"

ٹھگنو۔ "یہ ان کا کوئی دھرم نہیں ہے پھر بھلا ہم غریبوں پر کیوں رحم کرنے لگیں۔"

ٹھگنو کو اپنی دیوار کھڑی کرنے کے لئے کافی مصالحہ مل گیا۔ نیچ خاندان کی ہیں۔ ماں سے نہیں بنتی دھرم کرم سے خالی ہیں۔ پہلے دھاوے میں اتنی کامیابی کچھ کم نہ تھی۔ چلتے چلتے "خانساماں سے اتنا اور پوچھا" ان کے صاحب کیا کرتے ہیں؟"

خانساماں نے مسکرا کر کہا "ان کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ صاحب کہاں ہوں گے؟"

ٹھگنو نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "ارے اب تک بیاہ نہیں ہوا۔ ہمارے

یہاں تو یہ دنیا ہنسنے لگے۔

خانساماں" اپنا اپنا رواج ہے۔ ان کے ہاں کتنی ہی عورتیں عمر بھر بیاہ نہیں کرتیں"۔

جگنو نے افسردہ دلی سے کہا "ایسی کنواریاں تو میں بہت دیکھ چکی ہوں، ہماری برادری میں کوئی اس طرح رہے تو تھوڑی بڑی ہو جائے لیکن ان کے ہاں جو جی میں آئے کرو کوئی نہیں پوچھتا۔

اتنے میں مس خورشید آ پہنچیں۔ گلابی جاڑہ پڑنے لگا تھا۔ مس صاحبہ ساڑی کے اوپر اوور کوٹ پہنے ہوئے تھیں، ایک ہاتھ میں چھاتا تھا، دوسرے میں کتے کی زنجیر نسیم سحری میں ورزش نے گالوں کو تازہ اور سرخ بنا دیا تھا۔ جگنو نے جھک کر سلام کیا۔ پر انہوں نے اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا اندر جا کر خانساماں کو بلا کر پوچھا "یہ عورت کیا کرنے آئی ہے"۔

خانساماں نے جوتے کا فیتہ کھولتے ہوئے کہا "بیکار ہے حضور، پر عورت سمجھدار ہے۔ میں نے کہا "یہاں نوکری کرو گی تو راضی نہیں ہوئی۔ پوچھنے لگی "ان کے صاحب کیا کرتے ہیں جب میں نے بتا دیا تو اسے بڑا تعجب ہوا اور ہونا ہی چاہیئے ہندوؤں میں تو دودھ پیتی بچی تک کا بیاہ ہو جاتا ہے"۔

خورشید نے سوال کیا "اور کیا کہتی تھی"؟

"اور تو کوئی بات نہیں حضور"

"اچھا اسے میرے پاس بھیج دو"۔

(۴)

جگنو نے جوں ہی کمرے میں قدم رکھا مس خورشید نے کرسی سے اٹھ کر

اس کا استقبال کیا" آیئے ماں جی۔۔۔۔ میں ذرا سیر کرنے چلی گئی تھی آپ کے آشرم میں تو سب خیریت ہے۔"

جگنو ایک کرسی کا تکیہ پکڑ کر کھڑے کھڑے بولی" سب خیریت ہے،

مس صاحبہ میں نے کہا۔ آپ کو دعائیں دے آؤں میں آپ کی لونڈی ہوں، جب کوئی کام پڑے مجھے یاد کیجئے" گا۔ یہاں اکیلے تو حضور اچھا نہ لگتا ہوگا۔

مجھے اپنی اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ بڑا لطف حاصل ہوتا ہے وہ سب ہی میری لڑکیاں ہیں۔"

جگنو نے مادرانہ انداز سے سر ہلا کر کہا" یہ ٹھیک ہے مس صاحبہ پر اپنا اپنا ہی ہے دوسرا اپنا ہو جائے تو انہوں کے لئے کیوں رو ئے۔

اچانک ایک خوبصورت نوجوان ریشمی سوٹ ڈانٹے اندر داخل ہوا،

مس خورشید نے اس طرح دوڑ کر اس کا استقبال کیا، گویا جامہ میں پھولی نہ سماتی تھی جگنو اُسے دیکھ کر کونے میں دُبک گئی۔

خورشید نے نوجوان سے گلے ملتے ہوئے کہا" پیارے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں (جگنو سے) ماں جی آپ جائیں، پھر کبھی آنا، یہ میرے پیارے دوست ولیم کنگ ہیں ہم اور یہ دونوں بہت دنوں تک ساتھ ساتھ پڑھے ہیں۔"

جگنو پچھلے سے نکل کر باہر چلی آئیں۔ خانساماں کھڑا تھا، پوچھا یہ لونڈا کون ہے

خانساماں نے سر ہلایا" میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے، شاید کنوارپن سے دل بھر گیا اچھا طرحدار جوان ہے۔

جگنو۔ دونوں اس طرح ٹوٹ کر گلے ملے ہیں کہ میں شرم کے مارے گڑ گئی دونوں لپٹ گئے۔ لونڈا مجھے دیکھ کر جھجکا بھی تھا پر تمہاری مس صاحبہ تو جیسے

متوالی ہو گئی تھیں۔ خانساماں نے کہا "مجھے تو کچھ بے ڈھب معاملہ نظر آتا ہے۔

عگنو تو یہاں سے سیدھی مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی، ادھر مس خورشید اور نوجوان میں باتیں ہونے لگیں۔

مس خورشید نے قہقہہ لگا کر کہا "تم نے اپنا پارٹ خوب کھیلا، لیلا، بڑھیا سچ مچ جھنجھلا گئی۔

لیلا۔ میں تو ڈر رہی تھی کہیں بھانپ نہ جائے۔

مس خورشید۔ مجھے یقین ہے وہ آج ضرور آئے گی میں نے دور ہی سے اسے برآمدے میں دیکھا اور تمہیں اطلاع دی۔ آج آشرم میں بڑے مزے رہیں گے۔ جی چاہتا ہے عورتوں کی کانا پھوسیاں سنوں، دیکھ لینا سب ہی اس کی باتوں پر یقین کر لیں گی۔

لیلا۔ تم بھی تو جان بوجھ کر دلدل میں پاؤں رکھ رہی ہو۔

مس خورشید۔ مجھے ناٹک کھیلنے میں بڑا مزہ آتا ہے، بہن ذرا دل لگی رہے گی، بڑھیا نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے۔ ذرا اسے سبق دینا چاہتی ہوں کل تم اسی وقت اسی ٹھاٹھ سے پھر آ جانا۔ بڑھیا کل پھر آئے گی۔ اس کے پیٹ میں پانی نہ ہضم ہوگا، جس وقت وہ آئے گی تمہیں خبر دوں گی۔ بس تم چھیلا بنی ہوئی پہنچ جانا۔

(۵)

آشرم میں اس دن عگنو کو دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ اس نے سارا حال مسز ٹنڈن سے کہا۔ مسز ٹنڈن دوڑی ہوئی آشرم میں پہنچیں اور دوسری عورتوں کو خبر سنائی عگنو اس کی تصدیق کرنے کے لئے بلائی گئی جو عورت آتی وہ عگنو کے منہ سے یہ کہانی سنتی ہر ایک ریہرسل میں کچھ نہ کچھ رنگ چڑھ جاتا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے

سارے شہر کے مہذب حلقہ میں یہ خبر پھیل گئی۔

ایک عورت نے پوچھا "یہ آدمی کون ہے؟

مسز ٹنڈن۔ سُنا ہے اُن کے ساتھ کا پڑھا ہُوا ہے۔ دونوں میں پہلے سے کچھ بات چیت رہی ہوگی، وہی تو میں کہتی تھی کہ اتنی عمر ہو گئی یہ کنواری کیسے بیٹھی ہے، اب قلعی کھلی؟

جگنو اور کچھ ہو یا نہ ہو جوان تو بانکا ہے۔

مسز ٹنڈن۔ یہ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کا حال ہے۔

جگنو۔ میں تو ان کی صورت دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی، دھوپ میں بال سفید نہیں سکئے ہیں۔

ٹنڈن۔ کل پھر جانا۔

جگنو۔ کل نہیں میں آج رات ہی کو جاؤں گی۔ لیکن رات کو جانے کے لئے بہانا ضروری تھا، مسز ٹنڈن نے آشرم کے لئے ایک کتاب منگوا بھیجی رات کے ۹ بجے جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر جا پہنچی۔ اتفاق سے اس وقت لیلا وتی وہاں موجود تھی بولی "یہ بڑھیا بے طرح پیچھے پڑی۔"

خورشید میں نے تم سے کہا تھا۔ اس کے پیٹ میں پانی نہ بچے گا۔ تم جا کر دو پہر آدھ تب تک میں اسے باتوں میں لگاتی ہوں شرابیوں کی طرح اول جلول بکنا شروع کر دینا بس یوں بن جانا جیسے اپنے ہوش میں نہیں ہو۔

لیلا مشن میں ڈاکٹر تھی اس کا بنگلہ بھی پاس ہی تھا وہ چلی گئی تو مس خورشید نے جگنو کو بلا یا۔

جگنو نے ایک پرزہ دے کر کہا "مسز ٹنڈن نے یہ کتاب مانگی ہے مجھے آنے میں دیر ہو گئی، میں اس وقت آپ کو تکلیف نہ دیتی پر سویرے ہی وہ مجھ سے

مانگے گی ہزاروں روپے کی آمدنی ہے مس صاحبہ ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑتی ہے، ان کے دروازے پر بھکاری کو بھیک تک نہیں ملتی۔ مس خورشید نے پرزہ دیکھ کر کہا۔ اس وقت تو یہ کتاب نہیں مل سکتی، صبح لے جانا تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔ وہ پردہ اٹھا کر پیچھے کے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے کوئی پندرہ منٹ میں ایک خوبصورت ریشمی ساڑھی پہنے عطر میں بسی ہوئی منہ پر پاؤڈر لگائے نکلی جگنو نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، اوہو یہ سنگھار، شاید اس وقت وہ لونڈا آنے والا ہوگا تب ہی یہ سب تیاریاں ہیں ورنہ سونے کے وقت کنواریوں کو بناؤ سنگار کی کیا ضرورت، جگنو کی رائے میں عورتوں کے بناؤ سنگار کا صرف ایک مدعا تھا۔ خاوند کو لبھانا۔ اس لئے سہاگنوں کے سوا سنگار سب کیلئے منع تھا۔ ابھی خورشید کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ جوتے کی چرمر سنائی دی اور ایک منٹ میں ولیم کنگ نے کمرہ میں قدم رکھا اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور کپڑوں سے شراب کی بو آرہی تھی وہ مس خورشید سے لپٹ گیا۔

مس خورشید نے اپنے کو اس کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "چلو ہٹو شراب پی کر آئے ہو۔"

کنگ نے شرابیوں کی طرح کہا۔ "آج تمہیں بھی پلاؤں گا۔"

مس خورشید نے جگنو کی موجودگی کا اشارہ کیا کہ جگنو کی نظر پڑ جائے، پر کنگ نشہ میں مست تھا جگنو کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

مس خورشید نے غصہ سے اپنے کو الگ کر کے کہا: "یہ کیا بیہودگی ہے۔ چلو ہٹو۔"

کنگ اتنے دنوں سے چوروں کی طرح آتا ہوں۔ آج سے کھلے خزانہ آؤں گا۔"

"خورشید۔ تم پاگل ہو رہے ہو۔ دیکھتے نہیں کمرے میں کون بیٹھا ہوا ہے"

کنگ سنے حیران ہو کر جگنو کی طرف دیکھا اور جھک کر بولا "یہ بڑھیا یہاں کب آئی۔ بڑھی شیطان کی بچی، یہاں بھید لینے آئی ہے۔ ہم کو بدنام کرنا چاہتی ہے۔ میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔"

جگنو بلی کی طرح کمرہ سے نکلی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگی:

ادھر کمرہ سے قہقہے اٹھ اٹھ کر کمرہ کی چھت کو ہلانے لگے۔

جگنو اس وقت مس ٹنڈن کے گھر پہنچی اس کے پیٹ میں بلبلے اٹھ رہے تھے مگر مس ٹنڈن سو گئی تھیں، وہاں سے ناامید ہو کر اس کے کئی دوسرے گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹائیں، پر کوئی دروازہ نہ کھلا اور غریب کو ساری رات اسی طرح کاٹنی پڑی جیسے کوئی روتا ہوا بچہ گود میں ہو۔ صبح وہ آشرم میں جا کر کود دی، کوئی آدھے گھنٹے میں مسز ٹنڈن بھی آئیں، انہیں دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ مسز ٹنڈن نے پوچھا "رات کیا تم میرے گھر گئیں تھیں۔ اس وقت مجھے مہاراج نے کہا۔"

جگنو نے بے پروائی سے کہا "پیاسا تو کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ مجھے آگ میں جھونک کر آپ دور ہٹ گئیں، بھگوان نے حفاظت کی، نہیں کل جان ہی گئی تھی۔ مسز ٹنڈن نے بے قراری سے کہا "کیا ہوا۔ کچھ تو کہو مجھے تم نے جگا کیوں نہ لیا۔ تم جانتی ہو میری عادت سویرے سو جانے کی ہے۔"

جگنو۔ مہاراج نے گھر میں گھسنے نہ دیا، جگا کیسے لیتی۔ آپ کو اتنا تو سوچنا ہی چاہیے تھا کہ وہ وہاں گئی ہے تو آتی ہوگی۔ گھڑی بھر بعد سوتیں تو کیا بگڑتا پر آپ کو کسی کی کیا پرواہ؟

مسز ٹنڈن۔ تو کیا ہوا۔ مس خورشید مارنے دوڑیں کیا۔

جگنو۔ وہ مطلے ہتیں دندی ان کا وہ خصم مارنے دوڑا۔ لال لال آنکھیں

نکالنے آیا اور مجھ سے کہا نکل جا۔ جب تک میں نکلوں نکلوں تب تک ہنٹر کھینچ کر دے ہی تو پڑا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگتی تو کھال ادھیڑ ڈالتا۔ اور وہ رانڈ بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی دونوں میں پہلے سے ساز باز ہوگی ایسی فاحشہ عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے بازاری عورت بھی اتنی بے شرم نہیں ہوتی۔

ذرا دیر میں مستورات بھی آپہنچیں یہ حال سننے کیلئے سب ہی بیقرار تھیں۔ جگنو کی قینچی لگاتار چلتی رہی، مستورات کو اس ہجم کتھا سے اتنا لطف حاصل ہو رہا تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ایک ایک بات کو کرید کرید کر پوچھتی تھیں گھر کے کام دھندے بھول گئیں۔ کھانے پینے کی سدھ نہ رہی، اور ایک بار سن کر ان کا جی نہ بھرتا تھا۔ بار بار وہی سنتی تھیں اور نیا چٹخارہ لیتی تھیں۔

مسز ٹنڈن نے آخر کہا۔ اس آشرم میں ایسی عورتوں کا لانا خطرناک ہے آپ لوگ اس سوال پر غور کریں۔

مسز پانڈیا نے تائید کی ہم آشرم کو اپنے معیار سے گرانا نہیں چاہتے ہیں تو کہتی ہوں ایسی عورت کبھی بھی اسکول کی پرنسپل بننے کے لائق نہیں۔

مسز بھاٹیا نے فرمایا جگنو بائی نے ٹھیک کہا تھا۔ ایسی عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے اس سے صاف کہہ دینا چاہیئے۔ آپ یہاں تشریف نہ لائیں۔

ابھی یہی کھچڑی پک رہی تھی کہ آشرم کے سامنے ایک موٹر آ کر رکی سب عورتوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو موٹر میں مس خورشید اور ولیم کنگ بیٹھے ہوئے تھے۔

جگنو نے منہ پھیلا کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہی لونڈا ہے عورتوں کا سارا ہجوم جھٹ چک کے سامنے آنے کیلئے بے چین ہو گیا۔

مس خورشید نے موٹر سے اتر کر پٹ بند کر دیا اور آشرم کے دروازہ

کی طرف چلیں، مستورات بھاگ کر اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھیں۔

مس خورشید نے کمرہ میں قدم رکھا۔ کسی نے استقبال نہ کیا۔ مس خورشید
نے جگنو کی طرف بے جھجک آنکھوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "کہیئے باجی جی!
رات آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟ جگنو نے بہتری دیدہ دلیر عورتیں دیکھی تھیں پر اس دیدہ
دلیری نے اسے حیران کر دیا۔ چور ہاتھ میں چوری کا مال لئے شاہ کو پکار رہا تھا۔

جگنو نے اینٹھ کر کہا "جی نہ بھرا ہو تو اب ٹھوا دو، سامنے ہی تو ہیں۔"

خورشیدہ تو اس وقت اپنا قصور معاف کرانے آئے ہیں رات وہ
نشے میں تھے۔ جگنو نے مسز ٹنڈن کی طرف دیکھ کر کہا "اور آپ بھی تو کچھ کم نشہ میں
نہیں تھیں۔

خورشید نے مذاق سمجھ کر کہا "میں نے آج تک کبھی نہیں پی، مجھ پہ
جھوٹا الزام مت لگاؤ۔ جگنو نے لاٹھی ماری "شراب بھی بڑے نشہ کی چیز ہے۔ کوئی وہ
اسی کا نشہ ہوگا۔

ان صاحب کو کیوں پردہ میں ڈھانک دیا۔ یہ بھی تو ان کی صورت
دیکھتیں۔"

مس خورشید نے شرارت کی "صورت تو ان کی لاکھوں میں ایک ہے۔"

مسز ٹنڈن نے صاف کہا "نہیں ان کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں
آخر ہم کو ہم بدنام نہیں کرنا چاہتے۔

مس خورشید نے ضد کی۔ معاملے کو صاف کر لینے کے لئے اُن کا
آپ لوگوں کے سامنے آنا ضروری ہے۔ یک طرفہ آپ فیصلہ کیوں کرتی ہیں۔

مسز ٹنڈن نے ٹال لینے کے لئے کہا "یہاں کوئی مقدمہ تھوڑا ہی
پیش ہے۔"

مس خورشید واہ میری عزت پر بٹہ لگایا جارہا ہے۔ اور آپ کہتی ہیں کوئی مقدمہ نہیں ہے۔ مسٹر کنگ آئیں گے اور آپ کو ان کا بیان سننا ہوگا۔

سوائے مسز ٹنڈن کے سب ہی عورتیں کنگ کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھیں۔ کسی نے اختلاف نہ کیا۔

خورشید نے دروازہ پر آکر اونچی آواز سے کہا "تم ذرا یہاں چلے آؤ"

پٹ کھلا اور مس لیلاوتی ریشمی ساڑی پہنے ہوئے مسکراتی ہوئی نکل آئیں۔ آشرم میں سناٹا چھا گیا۔ عورتیں حیران ہوکر دیوی لیلاوتی کو دیکھنے لگیں۔

جگنو نے آنکھیں چمکا کر کہا۔ انہیں کہاں چھپا دیا آپ نے؟

خورشید۔ چھو منتر سے اُڑ گئے جا کر گاڑی دیکھو۔

جگنو لپک کر گاڑی کے پاس گئی۔ اور خوب دیکھ بھال کر منہ لٹکائے ہوئے بولی۔

مس خورشید نے پوچھا "کیا ہوا ملا کوئی"

جگنو۔ میں یہ تریاچرتر کیا جانوں؟ (لیلاوتی کو غور سے دیکھ کر) مردوں کو ساڑی پہنا کر آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو یہی تو ہیں وہ رات والے صاحب۔

خورشید۔ خوب پہچانتی ہو؟

جگنو "ہاں ہاں کیا اندھی ہوں"

مسز ٹنڈن۔ کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو جگنو یہ تو ڈاکٹر لیلاوتی ہیں۔

جگنو (انگلی چمکا کر) اسے جاؤ لیلاوتی، ساڑی پہن کر عورت بنتے

طرح بھی نہیں آتی تم رات کو ان کے گھر تھے۔

لیلاوتی نے مذاق کے لہجے میں کہا "میں کب انکار کر رہی ہوں، رات کو ولیم کنگ بھی بن جاتی ہوں۔ اس میں بات ہی کیا ہے۔

مستورات کو سچائی کی روشنی دکھائی دی چاروں طرف قہقہے بلند ہوئے کوئی تالیاں بجاتی تھی، کوئی ڈاکٹر لیلاوتی کی گردن میں لپٹی جاتی تھی کوئی مس خورشید کی پیٹھ پر تھپکیاں دیتی تھیں۔ کئی منٹ تک ہو حق مچا رہا تھا جگنو کا منہ اس روشنی میں ذرا سا نکل آیا۔ زبان بند ہو گئی۔ ایسا چرکا اس نے کبھی نہ کھایا تھا اتنی ذلیل کبھی نہیں ہوئی تھی۔

مسز مہرا نے ڈانٹ بتائی "اب بولو دائی" لگی منہ پر سیاہی کہ نہیں؟

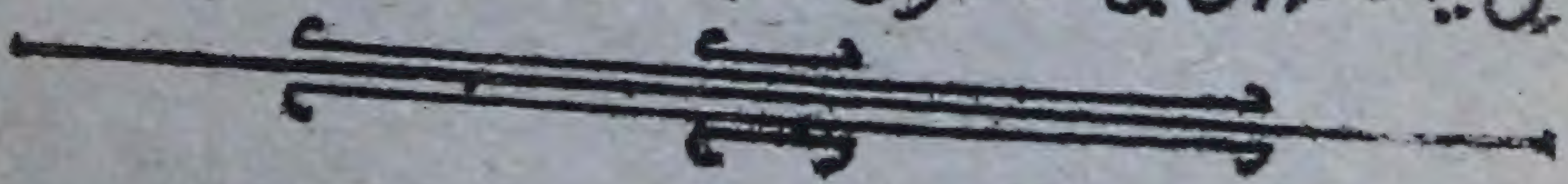
مسز بانگڑا۔ اسی طرح یہ سب کو بدنام کرتی ہے۔

لیلاوتی۔ آپ لوگ تو جو یہ کہتی ہیں اس پر یقین کر لیتی ہیں۔

مس خورشید نے کہا "ذرا اس سے پوچھو میرے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی"

مسز ٹنڈن نے پکارا۔ جگنو کہاں؟ تلاش ہونے لگی۔ جگنو غائب۔

اس دن سے پھر کسی نے جگنو کی صورت نہیں دیکھی۔ آشرم کی تاریخ میں یہ معاملہ آج بھی مائیہ تفریح بنا ہوا ہے۔



لاٹری

(۱)

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی. ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم سنگھ کے والد، چچا، بھائی، ماں، سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا. کون جانے کس کی تقدیر زور کرے۔ روپے رہیں گے تو گھر ہی میں کسی کے نام آ جائیں.

مجھے بھی اپنی تقدیر آزمانے کی سوجھی، اس وقت مجھے زندگی کا تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا وہ بہت ہمت افزا نہ تھا، لیکن تقدیر کا حال کون جانے. گاہ باشد کہ کودک ناداں. ایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بیتاب ہو گیا اور بکرم بھی بدرد کا دست نگر نہ بنا چاہتا تھا. جس کے نام روپے آئیں گے. وہ خود موج اڑائے گا. اُسے کون پوچھتا ہے. دس پانچ ہزار اس کے حصہ میں آ جائیں گے، مگر اس سے کیا

ہوگا۔ اس کی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ پہلے تو سارے دنیا کی سیاحت کرنی تھی، ایک ایک کونے کی۔ عام سیاحوں کی طرح نہیں جو کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اڑ کر گھر آ پہنچے۔ وہ ایک خطے میں کافی عرصہ تک رہ کر وہاں کے باشندوں کی معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ یورپ، برازیل، مڈغاسکر اور ابی سینیا، یہ سبھی دشوار گزار خطے اس کے پروگرام میں تھے۔ پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار کرانا تھا جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں۔ اس کے لئے وہ لاکھوں تک صرف کرنے کو تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے آئے تو شاید دو چار ہزار مل جائیں۔ بڑے بھائی کے نام آئے تو دھیلا بھی نہ ملے گا۔ ہاں اماں کے ہاتھ آئے تو بیس ہزار یقینی ہیں، مگر اس سے کہیں پیاس بجھتی ہے، منصوبے تو اتنے اونچے تھے لیکن روپے نہ ان کے پاس تھے نہ میرے گھر میں روپے ملنے کی اسے امید نہ تھی، ممکن تھا بہت ضد کرتا تو مل بھی جاتے مگر وہ اس امر کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ میرے پاس بھی روپے کہاں تھے، میں اسکول میں ماسٹر تھا، بیس روپے ملتے تھے، دس گھر بھیج دیتا دس میں ٹیشم ٹیشم اپنا گزارہ کرتا۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کے ٹکٹ خریدنا میرے لئے مشکل ہی نہیں محال تھا۔

بیگم نے کہا کہو تو میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں، کہہ دوں گی انگلی سے پھسل پڑی۔ میں نے منع کیا تھا، نہیں چوری فوراً کھل جائے گی اور مفت میں تشویش ہوگی۔ ایسا کام کیوں کرو کہ بعد میں خفت ہو۔ یہ تجویز ہوئی کہ ہم دونوں اپنی پرانی کتابیں کسی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے دوکاندار کے ہاتھ بیچ ڈالیں اور اس روپے سے ٹکٹ خریدیں۔ ہم دونوں کے پاس اسکول کی کتابیں ارتھمیٹک، الجبرا، جامیٹری، جاگرفی موجود تھیں، میں تو ماسٹر تھا، کبھی بکسیلر کی دکان پر جاتے جھینپتا تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے پہچانتے تھے۔ اس لئے یہ خدمت بیگم کے سپرد ہوئی اور وہ

آدھ گھنٹے میں پانچ روپے کا ایک نوٹ لئے آپہنچا۔ کتابیں پچیس سے کم نہ تھیں مگر یہ پانچ اس وقت ہمارے لئے پانچ ہزار کے برابر تھے، فیصلہ ہو گیا۔ ہم دونوں ساجھے میں ٹکٹ لیں گے آدھا میرا ہوگا آدھا بکرم کا دس لاکھ میں پانچ لاکھ میرے حصہ میں آئیں گے، پانچ لاکھ بکرم کے ہم اسی میں خوش تھے۔ ہاں بکرم کو اپنی ساحت والی اسکیم میں کچھ ترمیم کرنا پڑی، کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کی قطع و برید ناممکن تھی یہ بکرم کی زندگی کا مقصد دلی تھا۔

میں نے اعتراض کیا "یہ لازمی نہیں کہ تمہارا کتب خانہ شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہو ایک لاکھ بھی کچھ کم نہیں ہوتا"

بکرم مستقل تھا، ہرگز نہیں، کتب خانہ تو شہر میں لاثانی ہوگا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کرو گے؟

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا "بھئی میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔"

تمہارے گھر میں کافی جائیداد موجود ہے والدین بھی زندہ ہیں کسی قسم کا بار تمہارے اوپر نہیں ہے۔ میرے سر پر تو ساری گرہستی کا بوجھ ہے، دو بہنوں کی شادیاں ہیں، دو بھائیوں کی تعلیم ہے، نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا، میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود سے نکل آئیں اور اصل میں داغ نہ لگنے پائے۔ "کچھ ایسی قید لگا دوں گا میرے بعد کوئی اصل کو نہ نکال سکے۔

تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے، لیکن بینکوں کا شرح سود گرا ہوا ہے۔"

پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کم نہیں۔ اگر پانچ فیصدی بھی بٹے ۲۵ ہزار سالانہ ہوئے تھوڑے ہیں۔ ہم نے کئی بینکوں کی شرح سود دیکھا۔ واقعی بہت کم تھا۔

خیال آیا کیوں نہ لین دین کا کاروبار شروع کر دیا جائے۔ بکرم اور میں دونوں کی شرکت کمپنی ہو لین دین میں سود بھی اچھا ملیگا اور اپنا رعب داب رہیگا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے ہاں جب تک اچھی جائیداد نہ ہو کسی کو روپیہ نہ دیا جائے، چاہے کتنا ہی معتبر آسامی ہو، مجبوریاں بھلوں کو بھی غیر معتبر بنا دیتی ہیں۔ جائیداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھا کر روپیہ دینے میں کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ روپئے نہ وصول ہوں تو جائداد تو مل ہی جاتی ہے۔

مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے کس کا نام دیا جائے۔

بکرم نے کہا "میرا نام رہے گا"

"کیوں میرا کیوں نہ رہے گا؟"

"تمہارا ہی نام سہی، لیکن میری بہت دل شکنی ہوگی۔ اگر روپئے بل گئے تو میں گھر والوں پر گولا چھوڑوں گا، اور لوگوں کو خوب چڑاؤں گا۔ بالکل طفلانہ خواہش ہے۔

میں مجبور ہو گیا۔ بکرم کے نام سے ٹکٹ لیا گیا۔

(۲)

ایک ایک کر کے انتظار کے دن کٹنے لگے صبح ہوتے ہی ہماری نگاہ کیلنڈر پر جاتی میرا مکان بکرم کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اسکول جانے سے قبل اور اسکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھے اپنے منصوبے باندھا کرتے، اور سرگوشیوں میں کہ کوئی سن نہ لے ایک دن شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

بکرم نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ بھئی شادی وادی کا خلجان میں نہیں چاہتا خواہ مخواہ کی کوفت اور پریشانی۔ بیوی کی نازبرداری میں ہی بہت

سے روپے اُڑ جائیں گے۔ ہم بقائے نسل کے کوئی ٹھیکہ دار ہیں؟"
میں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا۔ "ہاں یہ تو درست ہے مگر جب تک شادی وغم میں کوئی رفیق نہ ہو، دولت کا لطف ہی کیا۔ تنہا خوری سے انسان کی طبیعت خود نفرت کرتی ہے، میں تو بغیر عیال داری سے اتنا بیزار نہیں ہاں رفیق ہو اور وہ بیوی کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔"
بجرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بولا "خیر اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے آپکو عیال داری مبارک بندہ تو آزاد رہے گا، اپنے مزے سے جہاں چاہا اڑ گئے اور جب جی چاہا سو گئے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر ایک حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے۔ ذرا سی دیر ہوئی اور فوراً جواب طلب "آپ کہیں سے چلے اور فوراً سوال ہوا، کہاں جاتے ہو؟ کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو۔"
میں نہ یہ سوال کسی سے کرنا چاہتا ہوں، اور نہ چاہتا ہوں مجھ سے کوئی یہ سوال کرے، "تو بابا آپ کو شادی مبارک، مجھے گز بھر کا ساز کلام ہوا اور آپ اڑے چلے جا رہے ہیں ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس، ذرا عمر کھسکی اور لونڈے تنبیق ماننے لگے کہ کب آپ راہی عدم ہوں اور وہ گل چھرے اڑائیں، نہ نہ میں اس وبال ....
بجرم کی بہن کنتی نے اسکے دھکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی۔ مگر بڑی خوش مزاج اور انتہا درجہ کی شوخ۔
بجرم نے ڈانٹا تو بڑی شیطان ہے کنتی، میں تو ڈر گیا کس نے تجھے بلا لیا یہاں؟"
کنتی نے مشتبہ نظروں سے بجرم کو دیکھا، جیسے کوئی تحقیقات کر رہی ہو اور بولی تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہو، جب دیکھو یہیں بیٹھے ہو۔

کوئی کام نہ دھندا کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے ایسے اچھے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے تم چلے ہی نہیں آخر میں کس کے ساتھ جاؤں۔ کیا کوئی جادو لگا ہے ہو؟

بیگم ہنسا "ہاں جادو جگا ہے ہیں۔ جس میں مجھے ایسا دولہا ملے جو کم روز پانچ مہر جبلے"۔

کنتی نے پیچھے کی طرف سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی "مجھے اپنا بیاہ نہیں کرنا ہے اماں سے پچاس ہزار روپے لیں گی اور مزے سے عیش کروں گی کیوں کسی مرد کی غلامی کروں، کھلائے گا تو دو روٹیاں اور حکومت ایسی جتائے گا گویا اس کی زر خرید لونڈی ہوں۔ مندی بانا آئی ایسی شادی سے! میں روز اماں کے ٹکٹ کیلئے ایشور سے پرارتھنا کرتی ہوں، اماں کہتی ہیں کنواری لڑکیوں کی دعائیں بڑی تاثیر ہوتی ہے، میرا تو دل کہتا ہے اماں کو ضرور روپے ملیں گے۔

مجھے اپنی ننھیال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بار دیہات میں بارش بالکل نہ ہوئی تھی بھادوں کا مہینہ آگیا اور پانی کی ایک بوند نہیں تب گاؤں والوں نے چندہ کر کے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی اور دوسرے دن موسلادھار بارش ہوئی تھی ضرور کنواری لڑکیوں کی دعائیں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میں نے بیگم کیطرف پر معنی نظروں سے دیکھا۔۔۔۔ نظروں ہی نظروں میں ہم نے فیصلہ کر لیا ایسا شغل پا کر کیوں چوکیئے۔

بیگم بولا اچھا بیٹی۔ تجھ سے ایک بات کہیں، کسی سے کہے گی تو نہیں اگر کہا تو ہلال کر دوں گا۔ میں اب کے تجھے خوب دل لگا کر پڑھاؤں گا اور پاس کرا دوں گا، ہم دونوں نے بھی لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے، ہم لوگوں کیلئے بھی ایشور سے دعا کر، اگر روپے ملے تو تجھے ہیرے جواہرات سے لڑھ دیں گے سچ، مگر خبردار کسی

سے کہنا مت مگر گنتی کا ہاضمہ اتنا مضبوط نہ تھا۔ یہاں تو وہ زعدہ کر گئی، مگر اندر جاتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک ہی لمحہ میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی اب جسے دیکھیے ہم دونوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دیئے، گھر میں چار ٹکٹ تو تھے ہی پانچویں کی کیا ضرورت تھی، یہ مائیں اسے خراب کر رہی ہیں نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا لے کے روپے پھینک دیئے خود رالفضیحت والی کہانی سامنے آئی۔ گھر کے بزرگ چاہے گھر میں آگ لگا دیں، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بچارے چھوٹے ان کی مرضی کے خلاف آواز بھی نکالیں تو کہرام مچ جاتا ہے۔

(۱۳)

بکرم کے والد ٹھاکر کہلاتے تھے، چچا چھوٹے ٹھاکر۔ دونوں ہی ملحد تھے، پکے ناستک، دیوتاؤں کے دشمن، پوجا پاٹ کا مذاق اڑانے والے، گنگا کو پانی کی دھارا اور تیرتھوں کو سیر کے مقامات سمجھنے والے مگر آج کل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے بڑے ٹھاکر صاحب علی الصبح ننگے پاؤں اشنان کرنے جاتے اور ادھر سے سارے شہر کے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہوئے کوئی گیارہ بجے گھر لوٹتے تھے، چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے روز ایک لاکھ رام نام لکھ کر تب جل پان کرتے۔ دونوں صاحب شام ہوتے ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے اور بارہ بجے رات تک بھاگوت کی کتھا سنا کرتے تھے۔ بکرم کے بھائی صاحب کا نام تھا پرکاش انہیں سادھو سنتوں سے عقیدت ہو گئی تھی انہیں کی خدمت میں وہ لگے رہتے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما نے آشیرواد دیا اور ان کا نام آیا۔ رہیں بکرم کی اماں جی ان میں ایسا کوئی خاص تغیر تو نہ تھا۔ ہاں آج کل خیرات زیادہ کرتی تھیں۔ اور برت بھی زیادہ رکھتی تھیں۔ درگا پاٹ کا بھی انتظام کیا تھا لوگ ناحق کہتے تھے کہ مادہ پرستوں

میں اعتقاد نہیں ہوتا میں تو سمجھتا ہوں ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دین داری ہے وہ ہماری مادہ پرستی کے طفیل، ہمارا دین اور مذہب ہماری دُنیا کے بل پر ٹکا ہوا ہے، ہوس انسان کی ایثار اور دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے یہ میرے لئے نیا تجربہ تھا اور محض روحانیت کا ملمع نہ تھا وہی خلوص، وہی نشہ، وہی انہماک گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں صاحب جو دار تھے ہمارے پاس روپے نہ تھے نہ اتنا وقت تھا مجھے نوکری بجانی تھی بکرم کو کالج جانا تھا ہم دونوں ہاتھ مل رہے تھے۔ ہاں جو تسکینوں کی تلاش میں رہتے تھے مگر اُن کیلئے بھی ہمارے پاس نیاز مندی اور خدمت گزاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں قتل کی رات قریب آتی جاتی تھی ہمارا سکون غائب ہوتا جاتا تھا ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا۔ میرے دل میں خواہ نخواہ یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں بکرم مجھے حصہ دینے سے انکار کر دے تو کیا کروں۔ صاف انکار کر جائے کہ تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا، نہ کوئی تحریر ہے، نہ کوئی دوسرا ثبوت۔ سارا دار و مدار بکرم کی نیت پر ہے۔ اسی کی نیت میں ذرا سا خلل آیا اور میرا کام تمام، کہیں فریاد نہیں کر سکتا، زبان تک نہیں کھول سکتا۔ اب اگر تحریر کیلئے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں، اگر اُسکی نیت بگڑ گئی ہے، تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا، اگر نیت درست ہے تو اس شبہے سے اُسے روحانی صدمہ ہوگا آدمی تو ایسا نہیں ہے۔ لیکن بھئی دولت پا کر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے، ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں۔ اسوقت ایماندار بننے میں خرچ نہیں ہوتا اتحاد کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔ میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا۔ اگر ٹکٹ میرے نام کا ہوتا اور حسن اتفاق سے میرا نام آگیا ہوتا تو کیا میں نصف رقم بے چون و چرا بکرم کے حوالے کر دیتا؟ کہتا، تم نے مجھے دس روپے قرض دیئے تھے ان کے بدلے پانچ سے لے لو، سو لے لو اور کیا کر دو گے؟ مگر نہیں

شاید اتنی بدیانتی کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی اگر دیتا بھی تو خوش معاملگی سے نہیں بلکہ بدنامی اور تشہیر کے خوف سے ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکایک بکرم نے کہا "ہمارا ٹکٹ نکل آئے مجھے دل میں یہ افسوس ضرور ہوگا کہ ناحق تم سے ساجھا کیا۔"

میں نے چونک کر کہا "اچھا، مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہو سکتا؟"

"لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"اچھا مان لو میں کہہ دوں، تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا۔"

"میرے خون کی حرکت بند ہو گئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔"

"میں تمہیں اتنا بدنیت نہیں سمجھتا۔"

"مگر ہے بہت ممکن، پانچ لاکھ سوچو۔"

"تو آؤ لکھا پڑھی کر لو، جھگڑا کیوں رہے۔"

بکرم نے ہنس کر کہا "تم بڑے شکی ہو یار" میں تمہارا امتحان لے رہا تھا بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے، پانچ لاکھ نہیں پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایشور چاہے گا تو نیت میں فتور نہ آنے دوں گا۔"

مگر مجھے ان اعتماد انگیز باتوں سے تشفی نہ ہوئی، دل میں ایک تشویش آگ کی چنگاری کی طرح سلگنے لگی، کہیں سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں۔

میں نے کہا "یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں فتور نہیں آسکتا لیکن تحریر سے پابند ہو جانے میں کیا ہرج ہے؟"

"فضول ہے۔"

"فضول ہی سہی۔"

تو پکے کاغذ پر لکھنا پڑے گا۔ دس لاکھ کی کورٹ فیس ہی دس ہزار ہو جائے گی کس خیال میں ہو آپ۔"

میں نے تامل کر کے کہا "مجھے سادے کاغذ ہی سے اطمینان ہو جائے گا۔"

"جس معاہدہ کی کوئی قانونی اہمیت نہ ہو، اسے لکھکر کیوں وقت ضائع کریں؟"

"قانونی اہمیت نہ ہو، اخلاقی اہمیت تو ہے۔"

"اچھا لکھ دوں گا، جلدی کیا ہے۔"

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا، بگڑ کر بولا "تمہاری نیت تو ابھی سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"تو کیا تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایسی حالت میں تمہاری نیت فاسد ہو جاتی۔"

"میری نیت اتنی کمزور نہیں ہے۔"

"اجی رہنے بھی دو بڑے بڑے نیت والے دیکھے ہیں۔"

"مجھے اپنے اوپر اعتبار نہیں رہا۔ میں تم سے معاہدہ لکھوا کر چھوڑوں گا چاہے دوستی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

بڑے نشست خانے میں جہاں دونوں ٹھاکر بیٹھا کرتے تھے اسی طرح کا مناظرہ چھڑا ہوا تھا جھڑپ کی آواز سنکر ہمارا دھیان ادھر لگا۔ دیکھا تو دونوں بھائیوں میں ہاتھا پائی ہو رہی ہے، سچ مچ اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر پینترے بدل رہے تھے۔

چھوٹے نے کہا "مشترکہ خاندان میں کسی کے نام سے روپے آئیں، ان پر سب کا مساوی حق ہے۔"

بڑے ٹھاکر نے بگڑ کر جواب دیا "ہرگز نہیں، جا کر قانون دیکھو اگر میں کوئی جرم کروں تو مجھے سزا ہو گی، مشترکہ خاندان کو نہیں، یہ انفرادی معاملہ ہے۔"

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔"

"شوق سے عدالت جائیے، اگر میرے لڑکے کی بیوی یا خود میرے نام لاٹری نکلی تو آپکو اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا، جیسے آپکے نام لاٹری نکلے تو مجھ سے یا میری لڑکی سے یا میری بیوی سے بیٹے

"اگر میں جانتا، آپ یہ پہلو اختیار کریں گے تو اپنی بیوی بچوں کے نام سے ٹکٹ لے لیتا۔

"تو یہ آپ کا قصور ہے۔"

"اسی لئے مجھے خیال تھا کہ آپ میرے حقیقی بھائی ہیں اور ایسے ایک جا معاملہ ہے۔"

"یہ جوا ہے، یہ آپ کو سمجھ لینا چاہئے۔"

"کریم کی ماں نے دونوں بھائیوں کو شمشیر بکف دیکھا تو دوڑی ہوئی باہر آئیں اور دونوں کو سمجھانے لگیں۔"

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے آپ مجھے کیا سمجھاتی ہیں، انہیں سمجھائیے جو بھائی کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ آپکے پاس چار ٹکٹ ہیں میرے پاس صرف ایک میرے مقابلے میں آپ لوگوں کو روپے ملنے کا چوگنا چانس ہے۔

بڑے ٹھاکر سے نہ رہا گیا بولے "ہم نے بیس روپے نہیں دیئے تھے ٹھن۔"

اماں نے انہیں ملامت کے انداز میں دیکھا، اور چھوٹے ٹھاکر صاحب کو ٹھنڈا کیا بولیں "تم میرے روپے سے آدھے لینا۔ میں اپنے بیٹے ......

بڑے ٹھاکر نے زبان پکڑلی۔ کیوں، یہ بات قسم کھا رہی ہو، وہ کیوں آدھا لے لینگے، میں ایک دھیلا بھی نہیں چھونے دونگا۔ اگر ہم انسانیت سے کام لیں تو بھی انہیں پانچویں حصے سے زائد کسی طرح نہ ملیگا۔ آدھے کا دعویٰ کس بنا پر ہو سکتا ہے۔

چھوٹے ٹھاکر نے خونی نظروں سے دیکھا، ساری دنیا کا قانون آپ ہی جانتے ہیں۔

"جانتے ہیں، بیس سال تک وکالت نہیں کی ہے؟"

"یہ وکالت نکل جائیگی، جب سامنے کلکتہ کا بیرسٹر کھڑا کر دوں گا۔"

"بیرسٹر کی ایسی تیسی۔"

"اچھا زبان سنبھال لیجئے میں نصف لونگا، اسی طرح جیسے گھر کی جائیداد میں میرا نصف ہے۔"

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے والے ہی تھے کہ مسٹر پرکاش سر اور ہاتھ میں پٹی باندھے خوش خوش لنگڑاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر پوچھا یہ تمہیں کیا ہو گیا، ارے یہ چوٹ کیسی، کیسی سے جھگڑا ہوا، ہائے ہائے۔ ارے مہنگو جاؤ ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ اماں جی نے پرکاش کو ایک کرسی پر لٹا دیا اور خود اشک سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھیں۔

پرکاش نے مسکرا کر حسرت ناک لہجے میں کہا "کچھ نہیں، ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی۔ بڑے ٹھاکر صاحب جو غم و غصے سے کانپ رہے تھے۔ کہا "کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی..... سارا ہاتھ اور سر سوج گیا ہے۔ کہتے ہو چوٹ نہیں لگی۔ کس سے جھگڑا ہوا، کیا معاملہ ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں۔ میں جا کر تھانے میں رپٹ کرتا ہوں۔"

"آپ ناحق گھبراتے ہیں بہت معمولی چوٹ ہے دو چار ہفتہ میں اچھی ہو جائیگی۔" اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسرت آمیز اُمید جھلک رہی تھی، ندامت غصہ یا انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

اماں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا، بھگوان کریں جلد اچھے ہو جاؤ۔ لیکن چوٹ لگی کیسے کیا کہیں تانگہ پر سے گر پڑے۔

پرکاش نے درد سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ کچھ نہیں نہ کہیں تانگہ سے گرا نہ کسی سے جھگڑا ہوا۔ ذرا جھگڑیا بابا کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ انہی کی دعا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں وہ آدمیوں کی صورت سے بھاگتے ہیں اور پتھر مارنے دوڑتے ہیں جو دوڑ کر

بھاگا وہ نامراد رہ جاتا ہے جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اسکی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ چوٹ کھائی اور پاس ہوئے۔ آج میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی مٹھائیاں لئے کوئی پھولوں کی مالا۔ کوئی شال دوشالہ لئے جھگڑو بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے۔ یکایک انہوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ مجمع دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اٹھا کر دوڑے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ گرتے پڑتے بھاگے۔ لیکن بندہ وہاں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا۔ بس انہوں نے پتھر چلا ہی تو دیا۔ پہلا پتھر سر میں لگا کھوپڑی جھنا گئی، معلوم ہوا جیسے گولا لگ گیا ہو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا پتھر ہاتھ میں لگا بس وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے اور گھنٹہ بھر تک مجھ سے اٹھا ہی نہ گیا آخر ہمت باندھ کر اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور انہوں نے کہا فریکچر ہو گیا ہے پٹی باندھ دی۔ بڑی شدت کا درد ہے مگر مراد پوری ہو گئی اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے مطلق شبہ نہیں سب سے پہلے جھگڑو بابا کی گٹی اور ان کا ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اماں جی کمال اللہ لیتے بھی دور ہو گیا سر پھٹا تو کیا ہوا۔ ہاتھ بھی ٹوٹا تو کیا غم ہے لاٹری تو اپنی ہو گئی۔

شام ہو گئی تھی، بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے بھگوت سننے کا وقت آ گیا تھا چھوٹے صاحب وہیں بیٹھے رہے ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ بولے جھگڑو بابا تو وہیں رہتے ہیں ندی کے کنارے بغیچے میں۔

پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا "جی ہاں"

"کیا بہت زور سے مارتے ہیں؟"

پرکاش نے ان کا منشا سمجھ لیا۔

آپ زور سے کہتے ہیں، ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم گولہ سا

لگتا ہے دیو ساقشہ ہے اور شہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ شیر دل کے گھونسے میں مار ڈالتے ہیں اُف سر مجھٹا جا رہا ہے ان کا نشانا ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ ہی نہیں سکتا۔ ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں جب تک گر نہ پڑیں مگر یاد رہی ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھلینگے اتنا ہی اپنے مقصد کے قریب پہنچیں گے۔ ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کیلئے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اسکا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے آدھا یا اس سے بھی کم۔ میں نے تو ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں لیکن جب تک نہ گر پڑوں گا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے جھکڑ بابا کی خدمت میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

(۴)

آخر جولائی کی بیسویں تاریخ آئی۔ سویرے ہی ڈاکخانے کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ تار کا انتظار ہونے لگا۔ دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے گنگا اشنان کیا اور مندر میں پوجا کر کے ہم دونوں بیا بھیدار دوں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر لیا بگرم تو ڈاکخانہ گیا۔ میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا۔ دونوں ٹھاکر بھی بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ اُنکے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی جو خدا سی بات میں ہنس دیتے ہیں اور ذرا سی بات میں رو دیتے ہیں۔

بڑے ٹھاکر نے پوچھا "بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں کیوں پجاری جی؟" پجاری نے فرمایا "ہاں سرکار! گنج کو گراہ کے منہ سے بچانے کے لئے بھگوان بیچر ساگر سے دوڑے تھے۔" چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا "بھگوان تو انتر جامی اور عالم الغیب ہیں کس میں کتنی بھگتی ہے، یہ کیا ان سے چھپا رہتا ہوگا۔"

لہ روایت ہے کہ ایکبار ہاتھی (گنج) ندی میں پانی پینے گیا۔ ندی میں ایک مگر تھا اس نے ہاتھی کی صفحہ ۱۱۳ پر

پجاری نے فرمایا "نہیں سرکار ان سے کیا چھپا ہے"

ادھر پوجا ہو رہی تھی۔ ادھر مندر کے باہر مساکین کو غلہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ بڑے ٹھاکر نے پوچھا "تمہارا دل کیا چاہتا ہے پجاری جی"

پجاری نے فرمایا "آپ کی ہے ہے (فتح) ہو گی سرکار"

چھوٹے سرکار نے پوچھا "اور میری"

پجاری نے بے تکلف کہا "آپ کی بھی ہے ہے ہو گی"

دونوں آدمیوں کی فتح کیسے ہو گی اس پر غور کرنے کی دونوں میں کسے فرصت تھی۔ کتھا ختم ہو گئی تو بڑے ٹھاکر صاحب نشہ عقیدت سے سرشار مندر سے نکلے بھجن گاتے ہوئے۔

سوچیں تو تیری چرنوں میں آیا
چھوٹے ٹھاکر صاحب بھبوت پہنے حمد و ثنا میں مصروف تھے۔

پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرش خاکی
اور سر پہ لاجورد کیا آسمان بنایا
زندگی میں جب ترا ہم کو ہمیشہ تھا خیال
بعد مردن بھی ہیں دل میں تیری لو لگائے

پرکاش بابو پٹیاں باندھے غریبوں کو غلہ بانٹ رہے تھے اور بار بار خون پو جا کر پوچھتے تھے، کیا خبر ہے، ہر شخص کے چہرے پر امید و بیم کا رنگ تھا، امید رگوں میں، آنکھوں میں، ہونٹوں میں امڈی پڑتی تھی۔ اور بیم دل میں دماغ میں، جگر میں رعشہ پیدا کر رہا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی سب کے سب دوڑے، وحیدہ بیگم کے ہاتھ لگا "کون ہے؟"

(باقی صفحہ ۱۱۲) ٹانگ پکڑ لی ہاتھی نے تب بھگوان کی یاد کی اور بھگوان اپنی جائے قیام چھوڑ کر دوڑ کے سمندر سے ہاتھی کی مدد کو۔

"میں ہوں بکرم!"

"کیا خوشخبری ہے"

"اس شہر کا صفایا ہے۔ شہر ہی کا نہیں، ہمارے ہندوستان کا امریکہ

کے ایک آدمی کا نام آیا ہے"

پرکاش بابو زمین پر گر پڑے۔ بڑے ٹھاکر صاحب پر جیسے فالج گر گیا

ہو۔ بے حس و حرکت نقش دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ

پیٹ کر رونے لگے۔

دل میں، مجھے بابو جی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسرت ہو رہی تھی کہ مجھے

بکرم کی خوشامد کرنے کی ذلت نہیں اٹھانی پڑی۔ اماں جان باہر نکل آئیں اور کہہ رہی تھیں

سبھوں نے بے ایمانی کی، کون وہاں دیکھنے گیا تھا۔

اس رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے

پجاری جی پر غصہ اتارا اور انہیں برخاست کر دیا اسی لئے تمہیں اتنے دنوں سے

پال رکھا ہے۔ حرام کا مال کھاتے ہو اور چین کرتے ہو۔

اتنے میں بکرم روحانی صورت لئے آکر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا "اب تو معاملہ ختم ہو گیا، مگر سچ کہنا، تمہاری نیت

فاسد تھی یا نہیں؟"

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرا اٹھا۔

اب کیا کرو گے پوچھ کر، پردہ ڈھکا رہنے دو۔"

نیور

آسمان میں چاندی کے پہاڑ اڑ رہے تھے، ٹکرا رہے تھے گلے مل رہے تھے، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، کبھی سایہ ہو جاتا، کبھی تیز دھوپ چمک اٹھتی تھی، برسات کے سوکھے دن تھے، اُمس ہو رہی تھی، ہوا بند ہو گئی تھی۔

گاؤں کے باہر کئی مرد ایک کھیت کی منڈیرھ باندھ رہے تھے ننگے بدن پسینے میں تر، کچھنی کسے ہوئے، سیاہ فام، سب کے سب پھاوڑے سے مٹی کھود کھود کر منڈیر پر رکھتے تھے، کئی دن قبل بارش ہوئی تھی، اس سے مٹی نرم ہو گئی تھی۔

گوبر نے اپنی کانی آنکھ مٹکا کر کہا "اب تو ہاتھ نہیں چلتا بھائی، گولا بھی چھوٹ گیا ہوگا، چلو چبینہ کر لیں۔"

نیور نے ہنس کر کہا "یہ منڈھ تو پوری کر لو پھر چبینہ کر لینا، میں تو تم سے پہلے آیا تھا۔

دنیا نے حقّہ سر پر اٹھاتے ہوئے کہا "تم نے اپنی جوانی میں جتنا گھی کھایا ہوگا نیور دادا اتنا تو اب ہمیں پانی بھی میسّر نہیں۔"

نیور لمبے قد، گٹھیلا، بے حد سیاہ، پھرتیلا آدمی تھا عمر پچاس سے زائد تھی مگر اچھے نوجوان محنت میں اس کا لوہا مانتے تھے۔ ابھی دو تین سال پہلے تک کشتی لڑتا تھا جب سے گھر کی گائے مری کشتی کرانا چھوڑ دیا مول کے دودھ میں گذارہ کہاں۔

گوبر نے پھر نیور کو چھیڑا "تم سے بے تمباکو کیسے رہا جاتا ہے۔"

"نیور دادا یہاں تو چاہے روٹی نہ ملے لیکن پاؤ بھر تمباکو ضرور چاہیئے۔"

نیورا اپنے کام میں مصروف تھا۔ نوجوانوں کی کلیا سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، دُنیا نے اسے باتوں میں لگانے کی دوبارہ کوشش کی، "تم یہاں سے جا کر روٹی پکا دو گے، دادا تمہاری بڑھیا کیوں کام نہیں کرتی، ہم سے تو دادا ایسی مہریا سے ایکدن نہ پٹے۔" اس کوشش کا اثر یہ ہوا۔ نیور کے پچکے ہوئے، کھچڑی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے چہرے پر تبسم کی نورانی لکیر کھنچ گئی جس نے اس کے کریہہ منظر میں بھی ایک حُسن پیدا کر دیا۔ بولا۔ "جوانی تو اس کے ساتھ گئی ہے بیٹا، اب اس سے کوئی کام نہیں ہوتا تو کیا کروں۔"

گوبر نے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے، تمہیں کام کیوں نہ کرتی! مجھے سے کھاٹ پر بیٹھی حکم چلایا کرتی ہے اور سارے گاؤں سے لڑا کرتی ہے۔ تم بڈھے ہو گئے ہو لیکن وہ تو اب بھی جوان بنی ہوئی ہے۔"

دنیا نے اور بھی اچھالا، "جوان عورت کیا اس کی برابری کرے گی؟ اندر کا جلال... جب دیکھو کنار دار رنگین ساڑھی، ہاتھوں کی مہندی، ان سنگاروں میں تو جیسے اس کا حق لیتا ہے۔

پہنتے ہی دیکھا۔ اس پر گہنے الگ، گہنوں سے اس کا جی ہی نہیں بھرتا، تم گنو بو اس سے بیاہ ہو جاتا ہے نہیں تو اب تک گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

گوبر نے تھوڑے دن پہلے اپنی عورت کو اسی لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ کام چور تھی، اور کھانے میں حاتم۔

دینا بولا، "مجھے تو اس کے بناؤ سنگار پر غصہ آتا ہے کچھ کام نہ کریگی کھانے پہننے کو اچھا ہی چاہئے۔"

نیور نے جیسے اپنی صفائی دی "تم کیا جانو گے بیٹا، تب تم لوگوں کا جنم ہی نہیں تھا جب وہ آئی تھی تو میرے گھر میں سات ہل چلتے تھے۔ وہ رانی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ تنی بھی بڑے گھر کی بیٹی۔ مجور لگے ہوئے تھے اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ جمانا لال گیا تو گیا، اس کا دل تو وہی ہے گھڑی بھر چولہے کے سامنے بیٹھ جاتی ہے تو آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور سر تھام کر پڑ رہتی ہے مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا اسی دن رات کیلئے تو آدمی شادی بیاہ کرتا ہے، نئی گرہستی میں جنجال کے سوا اور کیا رکھا ہے یہاں سے جا کر روٹی پکا ڈنگا۔ پانی لاؤں گا تب بڑی مشکل سے دو کور کھائے گی، نہیں مجھے اپنی کیا چنتا تھی، تمہاری چار پھنکی مار کر ایک لوٹا پانی چڑھا لیتا جب سے بیٹا مر گیا تب سے تو وہ اور بھی ٹوٹ گئی، یہ بڑا بھاری دھکا لگا۔ اس کو ماں کی ماتتا تم کیا سمجھو گے بیٹا، پہلے تو میں کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا تھا اب تو اس کو دیکھ کر درد آجاتا ہے۔"

دینا نے پوچھا۔ "تم کل روہ کو پوکا ہے کو چڑھ رہے تھے ابھی تو گولر نہیں پکی۔"

نیور کے چہرے پر رقت جھلک اٹھی، بولا، اس بکری کیلئے پتیاں توڑ رہا تھا۔ بیٹا اسی کا دودھ تو پیتی تھی۔ اب بچاری بڑھیا ہو گئی ہے دودھ کیا دے گی،

لیکن یہ کیسے بھول جاؤں کہ بیٹا اسی کا دودھ پیتی تھی۔

گھر پہنچ کر نیور نے لوٹا اور ڈول اٹھایا اور نہانے چلا کہ بیوی نے گھاٹ پر لیٹے لیٹے کہا: اتنی دیر کیوں کر دیتے ہو آدمی کام کے پیچھے جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے، جب مجبوری سب کو معلوم ہوتی ہے تو کام بھی برابر کرو، کوئی ایک دھیلا بیشی تو نہیں دیتا

نیور کے فضل نے دل پر سنہرے بادلوں کی طرح ایک مستانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لفظوں کی مٹھاس نے جیسے اس کے وجود کے ایک ایک ذرے کو مٹھاس میں تر بتر کر دیا اس بے غرضانہ محبت میں کتنا درد، کتنی دلچسپی، کتنی خیر اندیشی بھری ہوئی تھی اور دوسرا کون ہے جیسے اس کے آرام کی، اس کے مرنے جینے کی فکر ہو۔ پھر وہ کیوں نہ اپنی بڑھیا کے لئے مرے، مر رہے۔ اگر تو اللہ تم اس جنم میں کوئی دیوی رہی ہوگی بڑھیا نے میٹھی جھڑکی دی، اچھا رہنے دو یہ چاپلوسی، ہمارے آگے اب کون بیٹھا ہے جسکے لئے اتنی ہائے ہائے کرتے ہو۔

نیور دس گز کی چھاتی لئے نہانے چلا گیا لوٹ کر اس نے موٹی موٹی روٹیاں پکائیں آلو چولھے میں ڈال دیئے تھے، ان کا بھرتا بنایا، تب دونوں ساتھ کھانے بیٹھے بڑھیا نے حسرت سے کہا: میری چاٹ سے تمہیں کوئی آرام نہ ملا۔ پڑے پڑے کھاتی ہوں اور تمہاری چھاتی پہ مونگ دلتی ہوں اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ بھگوان مجھے اٹھا لیتے۔"

بھگوان آئینگے تو میں کہونگا پہلے مجھے لے چلو تب اس سونی جھونپڑی میں کون رہے گا:

"تم نہ ہوگے تو میری کون دشا ہوگی یہ سوچ کر میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے میں نے کوئی پن کیا تھا جو تمہیں پایا کسی اور کے ساتھ میرا کیا نباہ ہوتا۔

اس انکسار میں کتنا نشہ تھا۔ نیور کی ایک ایک رگ مخمور ہو اٹھی۔ اس

سے پہلے بھی کتنی بار یہ مسئلہ چھڑا تھا اور یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں نیور نے اپنے حق میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے میں جاؤں گا۔

اسکے بعد بھی بڑھیا جبتک جیتے آرام سے رہے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے اس لئے وہ مرتا رہتا تھا کہ ہاتھ میں چار پیسے ہو جائیں، سخت سے سخت کام جس کیلئے کوئی نہ کھڑا ہو وہ نیور کے ہاتھوں انجام پاتے اوان بھر پھاوڑے سے گارا کا کام کرنے کے بعد رات کو وہ ایکھ کے دنوں میں کسی کی ایکھ پیلتا یا فصل کی رکھوالی کرتا۔ لیکن دن نکلتے جاتے تھے، اور جو کچھ کماتا تھا وہ بھی نکلتا جاتا تھا۔ بڑھیا کے لئے کوئی آسرا نہ تھا لیکن آج کی باتوں نے نیور کے دل میں ہیبت ڈال دی۔ بیچ ہی میں کہیں بڑھیا ہی نہ چلی جاوے۔ پانی میں ایک بوند رنگ کی طرح یہ خیال اس کے دل میں سما کر گھلنے لگا۔

گاؤں میں نیور کیلئے کام کی کمی نہ تھی، پر مزدوری تو وہی ملتی تھی جو اب تک ملتی آئی تھی، اس کساد بازاری کے زمانے میں وہ مزدوری بھی نہ رہ گئی تھی کہیں بڑھیا پہلے چل بسی تو اسکے کریا کرم کیلئے تو ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ اس دھوم سے کام کرے گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں۔

اسی دن اتفاق سے ایک مہاتما کہیں سے گھومتے گھامتے آنکلے اور وہیں نیور کی جھونپڑی کے سامنے پیپل کے نیچے ان کی دھونی جل گئی۔ گاؤں والوں نے سمجھا بڑے نصیب بابا جی کی خدمت اور تکریم کے سامنے جمع ہونے لگے کہیں سے لکڑی آ گئی کہیں سے پیال، کہیں سے بچھانے کو کمبل نیور غریب کے پاس کیا تھا بابا جی کا بھوجن پکانے کی خدمت اس نے اپنے ذمے لی۔ چرس آ گئی بابا جی نے دم لگانا شروع کیا۔ بھگتوں کی ایک جماعت نے بھجن گانے کی تیاریاں کیں، ڈھول، مجیرا، کرتال آ گئے۔ دو تین دن میں ہی بابا جی کے کشف و کرامات کے چرچے ہونے لگے۔ وہ روشن ضمیر ہیں ان کی نگاہ پر

زمانے کی قید نہیں، لوبھ تو چھو ہی نہیں گیا، پیسہ ہاتھ میں نہیں چھوتے اور بھوجن بھی کیا کرتے۔ آٹھ پہر میں ایک کٹورہ دودھ پی لیا یا ایک دو چمچہ کھچڑی کھالی لیکن چہرے پر کتنا جلال ہے، جیسے شمع جل رہی ہو۔ زبان کتنی میٹھی ہے۔ سیدھا سادا نیور بابا جی کا خاص طور پر معتقد ہو گیا تھا۔ اس پر کہیں بابا جی کی دیا ہو گئی تو پار ہی ہو جائے گا، سارا دکھ دلدر دور ہو جائے گا۔

آدھی رات ہو گئی تھی۔ عقیدت مندوں کی جماعت رخصت ہو گئی تھی۔ صرف نیور بیٹھا بابا جی کے پاؤں دبا رہا تھا۔

بابا جی نے فرمایا "بچہ سنسار مایا ہے اس میں کیوں پھنسے ہو؟"

نیور نے فرق تعظیم جھکا کر کہا "نادان ہوں مہاراج، کیا کروں، عورت ہے اُسے کس پر چھوڑوں؟"

"تو سمجھتا ہے تو ہی اُس کا پالن کرتا ہے؟"

"اور دوسرا کون سہارا ہے اسے بابا جی؟"

"ایشور کچھ نہیں ہے، تو ہی سب کچھ ہے؟"

نیور کا ضمیر جیسے نور عرفان سے منور ہو گیا۔ میں اتنا مغرور ہوں اتنا خرد ماغ۔ اتنا کور باطن، مزدوری کرتے کرتے جان نکلی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں میں ہی بڑھیا کا سب کچھ ہوں، ایشور جو سارے سنسار کا پالن کرتے ہیں تو ان کی مرضی میں دخل دینے والا کون ہے اس کے زود اعتقاد دہقانی، باطن سے ایک صدا سی نکل کر اُسکی رگ رگ میں گونجنے لگی تو گیانی ہے، صرف اتنا بولا "آپ مجھے گیان دیجئے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو گرے۔ بابا جی نے تحکمانہ انداز سے کہا "دیکھنا چاہتا ہے ایشور کی لیلا وہ چاہے تو تجھے چھن بھر میں لکھ پتی کر دے، چھن بھر میں تیری ساری چنتائیں ہٹا دے۔ میں اس کا ادنیٰ غلام ہوں، کوے کی بیٹ، لیکن مجھ میں بھی اتنی کرامات ہے کہ تجھے

پارس بنا دوں گا۔ تو صاف دل، سچا ایماندار آدمی ہے مجھے تجھ پر دیا آتی ہے میں نے اس گاؤں میں ایک ایک کو غور سے دیکھا کسی میں بھی اعتقاد نہیں۔ ایمان نہیں۔ تجھ میں میں نے بھگت کا دل پایا۔ بتا تیرے پاس کچھ چاندی ہے۔

"نیور کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامنے جنت کا دروازہ کھلا ہے۔

"دس پانچ روپے پڑے ہوں گے مہاراج۔"

"چاندی کے ٹوٹے پھوٹے گہنے نہیں ہیں؟"

"گھر والی کے کچھ گہنے بھی ہیں۔"

"کل رات کو جتنی چاندی مل سکے یہاں لا، اور ایشور کی کرامات دیکھ۔ تیرے سامنے میں چاندی کو ایک ہانڈی میں کس کے بند کر کے اس دھونی میں رکھ دوں گا سویرے آکر ہانڈی نکال لینا مگر اتنا یاد رکھنا کہ ان اشرفیوں کو شراب جوا یا کسی دوسرے بُرے کام میں خرچ کیا تو کوڑھی ہو جائیگا۔ اب جا سو رہ، ہاں اتنا من لے اسکا چرچا کسی سے مت کرنا گھر والی سے بھی نہیں" نہیں......"

نیور گھر چلا تو ایسا خوش تھا، گویا ایشور کا ہاتھ اسکے سر پر ہے رات بھر اُسے نیند نہیں آئی، سویرے اس نے کئی آدمیوں سے دو دو چار روپے ادھار لیکر پچاس روپے جمع کر لئے لوگ اس کا اعتبار کرتے تھے کبھی کسی کا پیسہ نہ دبایا تھا، وعدے کا پکا نیت کا صاف روپے ملنے میں دقت نہ ہوئی۔ پچیس روپے اُس نے اپنی کمائی سے بچو رکھے تھے مگر بڑھیا سے گہنے کیسے مانگے لگے گی طرح طرح کے سوال پوچھنے، کیا کرو گے کسی کو دے تو نہ دو گے چکمہ دیا تیرے گہنے بہت میلے ہو گئے ہیں بڑھیا کھٹائی سے صاف کر لے۔ رات بھر کھٹائی میں رکھنے سے نئے ہو جائیں گے تب میں پٹوے کے پاس سے جا کر نئے ڈورے میں گتھیا لاؤں گا۔ بڑھیا چکمے میں آ گئی۔ نیور کی جانب سے کسی طرح کا شبہ ہونا امکان سے بعید تھا۔ ہانڈی میں کھٹائی ڈالکر بھگو دیئے۔ جب وہ رات کو سو گئی تو نیور نے روپے بھی اس ہانڈی میں ڈال دیئے اور

ہانڈی لئے باباجی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بھگت لوگ رخصت ہو چکا تھا مطلع صاف تھا بابا نے بے اعتنائی کے انداز سے ہانڈی لے لی کچھ منتر پڑھ کر پھونکا اور ہانڈی کو دھونی کی راکھ میں رکھ کر نیور کو سورج نکلنے کے پہلے آنے کی تاکید کر کے رخصت کیا۔

رات بھر اشتیاق بامراد گدگدی کا مزہ لیتے اور خیالی پلاؤ ڈکانے کیلئے نیور منہ اندھیرے باباجی کے درشن کرنے گیا، سینہ بانسوں اچھل رہا تھا۔ کل یہ جھونپڑی نہ رہے گی اور نہ بڈھیا اس حالت میں رہے گی یہیں بڑھیا کے نام پر ایک کنواں کھدوا دے گا اور ایک مندر بنے گا۔ مگر نیور اسی طرح چار آنے روز کی مزدوری کرتا رہے گا۔ دولت پا کر آدمی اپنے کو نہ بھولے عیب سے اترانے لگے تو کیا رہ گیا۔ ایں باباجی دھونی کے پاس نہیں گئے ہوں گے ندی کی طرف اُن کے انتظار کی ضرورت نہیں، انہوں نے کہہ دیا تھا سورج نکلنے کے پہلے آ کر ہانڈی نکال لینا۔ جھٹ دھونی میں ہاتھ ڈالا ہانڈی ملی، مگر بالکل خالی، سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ پھر راکھ ٹٹولی کچھ نہ ملا۔ کوئی ہانڈی سے اشرفیاں نکال تو نہیں لے گیا باباجی نے کہیں احتیاطاً چھپا کر نہیں رکھی ہوں۔ بدحواس ہو کر باباجی کی تلاش میں ندی کی طرف دوڑا باغوں میں ڈھونڈا بابا کی گرد بھی نہ ملی۔ مایوس ہو کر لوٹا اور وہیں دھونی کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بھگت لوگ آنے لگے ارے بابا کہاں گئے کمبل بھی غائب، یہ ماجرا کیا ہے؟ ایک صاحب بولے رمتے سادھوؤں کا کیا ٹھکانا، آج یہاں کل وہاں ایک جگہ رہیں تو مایا جال میں نہ پھنس جائیں لوگوں سے میل محبت ہو جائے

دوسرے بھگت نے کہا پہنچے ہوئے تھے۔

"پورے سادھو"

"لو بھر تو پوچھو نہیں گیا تھا"

"نیور کہاں اس پر بڑی دیا کرتے تھے اس سے کہہ گئے ہوں گے۔

نیور دفعتہ لاپتہ ہو گیا۔ اس کی تلاش ہونے لگی اتنے میں بڑھیا نیور کو پکارتی ہوئی گھر سے نکلی پھر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بڑھیا روتی تھی اور نیور کو گالیاں دیتی تھی۔

نیور کھیتوں کی مینڈھ سے بے تحاشہ بھاگتا ہوا جا رہا تھا گویا اس دلدل سے نکل جائے گا، ادھر نیور کی بدنیتی کے قصے کھلنے لگے۔ "کل ہم سے پانچ روپے لئے تھے۔ آج شام کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہم سے بھی دو روپے لئے تھے آج ہی کے وعدہ پر لئے تھے۔"

بڈھیا روئی، داڑھی جاؤ میرے سامنے سے گننے کے گیا پچیس روپے جوڑ کر رکھے تھے وہ بھی اٹھا لے گیا۔

ایک آدمی نے اس کی ملامت کی، کیوں اسے گالی دیتی ہے بڈھیا تیرے لئے جان دیتا ہے اور آج تو اسے گالیاں دے رہی ہے اسکی نیت کبھی نہیں بدل سکتی۔ اس بابا نے اسے ضرور چکمہ دیا ہوگا، بچارہ سیدھا آدمی تھا جھانسے میں آ گیا۔ بڑا مکار نکلا یہ بابا۔

قرائن اس شبہ کی تصدیق کر رہے تھے۔

"نیور لاج کے مارے کہیں چھپا بیٹھا ہوگا۔"

"جو گنگا میں نہ کود پڑا ہو۔"

"بابا ملے تو کچا ہی کھا جائیں۔"

"تین مہینے گزر گئے۔"

جھانسی ضلع میں دھسان ندی کے کنارے ایک بڑا گاؤں ہے۔ کاشی پور ندی کے دوسرے کنارے ایک پہاڑی ہے اس پر کئی دن سے ایک سادھو نے آسن جمایا ہے ناٹے قد کا آدمی ہے کالے توے کا سا رنگ جسم گٹھا ہوا، یہ نیور ہے جو سادھوؤں کے بھیس میں دنیا کو دھوکہ دے رہا ہے وہی بھولا بھالا صاف دل بے لوث نیور جس نے کبھی پرائے مال کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی جو پسینے کی روٹی کھا کر مگن تھا جو کبھی اپنے لئے نہیں ہمیشہ دوسروں کیلئے مرا۔ گھر کی اور گاؤں کی اور بڈھیا کی یاد اس کے دل سے ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں اترتی اس کی زندگی میں کیا پھر کوئی دن آئیگا کہ وہ گھر پہنچے گا اور پھر اس دنیا میں ہنستا کھیلتا اپنی

چھوٹی چھوٹی فکروں اور چھوٹی چھوٹی اُمیدوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کتنی پُرعافیت تھی وہ زندگی جتنے تھے سب اپنے تھے سبھی عزت کرتے تھے ہمدردی کرتے تھے دِن بھر کی کڑی محنت کے بعد جب وہ تھوڑا اناج اور تھوڑے سے پیسے لیکر گھر آتا تو بڑھیا اس سے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی، وہ ساری محنت اور تھکاوٹ جیسے اس مٹھاس میں بک کر اور بھی میٹھی ہو جاتی تھی، آہ وہ دِن کب آئینگے؟ نہ جانے بڑھیا کیسے رہتی ہوگی کون اُسے پان کیطرح پھیرتا ہوگا کون اُسے پکا کر کھلاتا ہوگا۔ گھر میں ایک پیسہ بھی تو نہیں چھوڑا۔ آئے گنتے تک ڈبا دیئے تب اُسے اس بابا پر ایسا غصہ آیا کہ پا جائے تو خون ہی پی لے، ہائے رے لالچ۔

اسکے خاص عقیدت مندوں میں ایک حسینہ بھی تھی جسے اپنے شوہر نے کئی سال سے چھوڑ رکھا تھا۔ حسینہ کا باپ فوجی پنشنر تھا ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے لڑکی کی شادی کی لیکن لڑکا اپنی ماں کا سعادت مند فرزند تھا، اور حسینہ اپنی ساس کو خوش نہ رکھ سکی وہ چاہتی تھی ساس سے علیحدہ ہو کر شوہر کے ساتھ رہے، شوہر اپنی ماں سے الگ ہونے پر راضی نہ ہوا، ماں کی قربانیوں کو کیسے بھول جائے۔ بہو روٹھ کر میکے چلی آئی تب سے تین سال ہو گئے اور سسرال سے ایکبار بھی بلاوا نہ آیا۔ نہ شوہر ہی نے آنے کی تکلیف کی نادان کسی طرح اپنے شوہر کو بس میں کر لینا چاہتی تھی مہاتماؤں کیلئے کسی کا دِل کسی کیطرف پھیر دینا کیا مشکل ہے۔ ہاں اُن کی نظر کرم چاہیئے۔

ایک دن اس نے تخلیہ میں باباجی سے اپنی داستان غم سنائی۔ تیور کو جس شکار کی تلاش تھی وہ آج بہت دِنوں کے بعد پھنسا ہوا معلوم ہوا، اقدس کی شان سے بولا میں نہ مہاتما ہوں نہ عامل نہ دُنیا کی مایا جال میں پڑتا ہوں لیکن تیری سردھا اور پریم دیکھ کر تجھ پر رحم آتا ہے بھگوان نے چاہا تو تیری مراد پوری ہو جائے گی۔

اس انکسار نے اُسکا رنگ اور بھی جما دیا۔ لڑکی نے تلووں پر سر رکھکر عرض کی "آپ سب کچھ کر سکتے ہیں مہاراج! مجھے آپ کے اوپر وشواس ہے۔"

"بھگوان جی کی جو مرضی ہو گی وہ ہو گا میں کچھ نہیں ہوں۔"

"اس بد نصیب کا ڈونگا آپ ہی پار لگا سکتے ہیں۔"

"ایشور پر بھروسہ رکھو۔"

"میرے ایشور تو آپ ہی ہیں۔"

تیور نے گویا منتوں سے بہت مجبور ہو کر کہا "لیکن بیٹی اس کام میں بہت سے انوشٹھان (عملیات) کرنے پڑینگے اور انوشٹھان میں سینکڑوں، ہزاروں پیسے کا خرچ ہے اس پر بھی تیری مراد پوری ہو گی یا نہیں، کہہ نہیں سکتا، ہاں میرے لئے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ میں کیا کروں گا، مگر سب کچھ بھگوان کے ہاتھ ہے میں مایا کو ہاتھ سے نہیں چھوتا لیکن تیرا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔

اسی رات کو اس غرض کی باؤلی نے اپنے گہنوں کی پٹاری بابا جی کے قدموں پر رکھ دی بابا جی نے متنفر ہاتھوں سے پٹاری کھولی اور چاند کی سی روشنی میں زیورات کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اب اگر ان میں کچھ عقل ہو تو یہ ساری مایا ان کی ہے۔ وہ نیا اُن کے سامنے دست بستہ کہہ رہی ہے مجھے قبول کیجئے، کرنا ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں ہو محض پٹاری لے کر اپنے سرہانے رکھ لیتا ہے اور لڑکی کو دعائیں اور تقویت دے کر رخصت کر دیتا ہے وہ سویرے آئے گی اس وقت تک وہ اتنی دور ہوں گے جتنی دور ٹانگیں لے جائیں۔ ایسی غیر مترقبہ نعمت۔ جب وہ روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی لئے گھر پہنچیں گے اور بڑھیا کے سامنے رکھ دیں گے۔ اس وقت بڑھیا......

لیکن نہ جانے کیوں اتنا ذرا سا کام بھی اس سے نہیں ہو سکتا۔ وہ پٹاری کو کھول کر اپنے سرہانے کمبل کے نیچے دبا کر نہیں رکھ سکتا ہے، کچھ نہیں اس سے زیادہ آسان کام دنیا میں نہ ہو گا مگر اس کیلئے بلغ ہے، ہمت شکن ہے ہنفق ان ہے، وہ پٹاری کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھا سکتا۔ ہاتھوں پر اس کا کوئی زور نہیں ہے جانے دو ہاتھ

سمجھ لو کٹ گئے۔ زبان پر تو اس کا قابو ہے اتنا کہنے میں کونسی دنیا الٹی جاتی ہے کہ بیٹی پٹاری اٹھا کر کمبل کے نیچے رکھ دو۔ زبان کٹ تو نہ جائیگی، مگر اس پر حقیقت کھلتی ہے کہ زبان پر بھی اس کا قابو نہیں ہے، آنکھوں کے اشارے سے بھی وہ کام ہو سکتا ہے۔ لیکن اس موقع پر آنکھیں دغا دے رہی ہیں۔ دل کا بادشاہ اتنے وزیروں اور مشیروں کے ہوتے ہوئے بھی لاچار ہے ضعیف ہے لاکھ روپئے کی تھیلی سامنے رکھی ہو، ننگی تلوار ہاتھ میں ہو گائے مضبوط رسی سے بندھی ہو، کیا اس گائے کی گردن پر اسکے ہاتھ اٹھیں غیر ممکن، کوئی خود اس کی گردن کاٹ لے مگر وہ گئو کی ہتیا نہیں کر سکتا وہ غم نصیب مظلوم عورت اسکی نظروں میں اس گئو کی طرح بے زبان، قابل رحم تھی جس موقع کو وہ اتنے دنوں سے تلاش کر رہا ہے۔ اسے پا کر آج اسکا ضمیر لرز رہا ہے اور روح کانپ رہی ہے اس کی ہوس فطرتاً بھی وحشی جانوروں کی طرح خونخوار ہے لیکن عرصہ دراز تک زنجیر میں بندھے رہنے سے اس کے ناخن گر گئے ہیں اور دانت کمزور ہو گئے ہیں۔

اس نے فاتحانہ انداز سے کہا "بیٹی پٹاری اٹھا لے جاؤ، تمہاری مراد پوری ہو جائے گی میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔

چاند ندی کے اس پار درختوں کی گود میں محو خواب تھا، تیواری آہستہ سے اٹھا اور ایکطرف چل دیا۔ بھبھوت اور تلک سے اسے نفرت ہو رہی تھی اسے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ گھر سے نکلا ہی کیوں، تھوڑی سی رسوائی اور تضحیک کے خوف سے نہیں حمیت کے زیر اثر دغا اور ریا نے اس میں شیطانی جذبات کو برانگیختہ کیا تھا، ان سے مغلوب ہو کر اور آج ایک معصوم مظلوم آتما کے اعتقاد اور اعتماد میں اس نے اپنی کھوئی ہوئی حقیقت کو پھر پا لیا تھا ایسا خوش تھا گویا وہ زنجیروں سے آزاد ہو گیا ہو۔ ایک نئی سحر کا طلوع اس کی روح کو ایک نورانی ضیاء سے منور کر رہا تھا اور اسکی رگ رگ سے اسکی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

تیواری آٹھویں دن اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ لڑکوں نے دوڑ کر اچھل کود

کر، ناچ کر اس کے ہاتھ سے لکڑی چھین کر اس کا خیر مقدم کیا۔

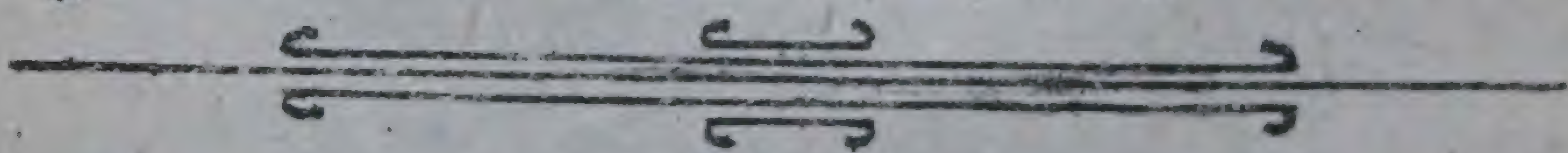
ایک لڑکے نے کہا "کاکی تو مر گئی نیور دادا"

نیور کے پاؤں جیسے بندھ گئے منہ کے دونوں کونے نیچے جھک گئے اور آنکھیں بجھ گئیں کچھ بولا نہیں، کسی سے کچھ پوچھا بھی نہیں، پل بھر جیسے غشی کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر دیوانہ وار ایک بے خودی کے عالم میں اپنی جھونپڑی کی طرف چلا لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے مگر ان کی طفلانہ شرارت غائب ہو گئی تھی، نادانستہ طور پر وہ سب بھی اس حادثہ غم سے متاثر ہوئے۔

جھونپڑی کھلی پڑی تھی۔ بڈھیا کی چارپائی جوں کی توں بچھی ہوئی تھی ایک گوشہ میں دو چار پیتل کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ لڑکے باہر ہی رہ گئے اندر کیسے جائیں وہاں تو بڈھیا بیٹھی ہے۔

گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ نیور دادا آگئے۔ جھونپڑی کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔ سوالات کی یورش ہونے لگی، تم اتنے دن کہاں تھے دادا۔ تمہارے جانے کے تیسرے دن کاکی چل بسی۔ رات دن تمہیں گالیاں دیتی تھی، مرتے دم تک تمہیں کوستی رہی۔ تیسرے دن ہم لوگوں نے دیکھا تو اکڑی پڑی تھی۔ تم اتنے دن کہاں رہے، وہ مکار بابا پھر نہیں دکھائی دیا۔ نہیں تو کھود کر گاڑ دیتے۔

نیور نے جواب نہ دیا۔ حرف مایوس، دردناک، مجروح، خالی آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتا رہا گویا حس ہی نہ ہو۔ اس دن سے کسی نے اسے روتے یا ہنستے نہیں دیکھا۔ ہاں محنت وہ اسی طرح کرتا ہے، اور اس کی مزدوری صرف دو روٹیاں ہیں۔



لعنت

کاؤس جی نے اخبار نکالا اور شہرت کمانے لگے شاپور جی نے روٹی کی ڈالی شروع کی اور دولت کمانے لگے۔ کمائی دونوں ہی کر رہے تھے لیکن شاپور جی خوش تھے کاؤس جی دل گرفتہ شاہ پور جی کو دولت کے ساتھ عزت اور شہرت خود بخود مل رہی تھی اکاؤس جی کو شہرت کیساتھ دولت دوربین سے دیکھنے پر بھی کہیں نظر نہ آتی تھی اس لئے شاپور کی زندگی میں سکون تھا، عافیت تھی، اُمید تھی، درد تھا اور چہل پہل تھی کاؤس کی زندگی میں تلخی تھی، ناکامی تھی مایوسی تھی بیزاری تھی، بے دردی تھی، دولت کو حقیر سمجھنے کی وہ بہت کوشش کرتے تھے لیکن جو عریاں تھا اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا غیر ممکن تھا۔ شاپور جی کی دولت کدہ میں جو فراخدلی اور مہمان نوازی اور شرافت تھی اس کے مقابلہ میں انہیں اپنے گھر کی بے سروسامانی، تنگ دلی، ترش اور بدخلقی سے نفرت ہوتی تھی، شیریں بیاں اور خوش خلق مسز شاپور کے سامنے انہیں اپنی گلشن بالکل کم ظرف اور حسد کی پتلی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مہمانوں سے گویا کوئی پرخاش ہو، جو سیدھی سی بات بھی کہتی تو طنز اور جگر خراش کنایوں کے ساتھ۔ شاپور جی گھر میں آتے تو شیریں بائی تبسم اور گرمجوشی سے اُن کا خیر مقدم کرتی، کاؤس جی خود تھکے ماندے پریشان حال

گھر آتے تو گلشن اپنا دکھڑا سنانے بیٹھ جاتی، اور ان کو خوب ملامت کرتی، تم بھی اپنے کو انسان کہتے ہو، میں تمہیں بیل سمجھتی ہوں، "نرا چارپیروں والا بیل" بیل بڑا غریب ہے، سیدھا ہے، محنتی ہے، صابر ہے، مانا لیکن پھر اسے شادی کرنے کا کیا حق تھا۔ کاؤس جی سے ایک لاکھ بار یہ سوال کیا جا چکا تھا کہ جب تمہیں اخبار نکال کر اپنی زندگی برباد کرنی تھی تو تم نے شادی کیوں کی، اپنے ساتھ مجھے کیوں لے ڈوبے، جب تمہارے گھر میں دو روٹیاں نہ تھیں تو مجھے کیوں لائے؟ اس سوال کا جواب دینے کی غریب کاؤس میں ہمت نہ تھی نہ طاقت اور نہ صلاحیت، انہیں کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا۔ وہ خود اپنی غلطی پر پچھتاتے تھے۔ ایک بار بہت تنگ آکر انہوں نے کہا تھا، اچھا بھئی اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ لیکن میں تمہیں باندھے ہوئے تو نہیں ہوں تمہیں جو مرد زیادہ آرام سے رکھ سکے اس کے ساتھ جا کر رہو۔ اب میں کیا کروں؟ دولت نہیں ملتی تو کیا جان دیدوں۔ اس پر گلشن نے ان کے دونوں کان پکڑ کے زور سے اینٹھے اور گالوں پر دو طمانچے لگائے اور شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر بولی "اچھا اب سنبھالو زبان ورنہ برا ہوگا۔ ایسی شرمناک بات کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ مگر غیرت ہوتی تب تو۔ تم نے شرم تو جیسے گھول کھائی" تب سے بیچارے کاؤس کے پاس اس سوال کا جواب نہ رہا کہاں تو یہ بدمزاجی اور سرکشی اور دست درازی کہاں وہ تپاک اور خلوص اور تہذیب کی پتلی شیریں جو کاؤس جی کو دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل جاتی... میٹھی میٹھی باتیں کرتی، چار مربے اور پھلوں سے خاطر کرتی اور اکثر انہیں اپنی کار پر سیر کرانے لے جاتی، کاؤس جی نے کبھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ دینے کی ہمت نہیں کی مگر وہ خیال ایک آرزو کی صورت میں وہاں چھپا ہوا تھا۔ کاش گلشن کی طرح شیریں ان کی رفیق حیات ہوتی تو ان کی زندگی کتنی قابل رشک ہوتی۔ کبھی کبھی گلشن کی بدزبانیوں سے وہ اتنا رنجیدہ ہوتے کہ موت کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتے، گھر ان کیلئے قید خانے سے کم دل آزار نہ تھا اور انہیں جب موقع ملتا سیدھے شیریں کے گھر جا کر اپنے دل کی جلن ٹھنڈی کر آتے۔ ایک دن کاؤس جی علی الصباح

گلشن سے برگشتہ خاطر ہو کر شاپو رمنزل پہنچے تو دیکھا شیریں بانو کی آنکھیں سُرخ ہیں اور چہرہ تمتمایا ہوا ہے، گویا حرارت ہو، گھبرا کر پوچھا آپ کی طبیعت کیسی ہے بخار تو نہیں آگیا شیریں نے مایوس نظروں سے دیکھ کر دردناک لہجہ میں کہا، نہیں نہیں، بخار نہیں کم سے کم جسمانی بخار تو نہیں ہے

کاؤس جی اس معمے کو نہ سمجھ سکے۔

شیریں نے ایک لمحہ خاموش رہ کر پھر کہا "آپکو میں مہربان سمجھتی ہوں کاؤس جی آپ سے کیا چھپاؤں؟ میں اب زندگی سے عاجز آگئی ہوں میں نے اب تک دل کی آگ دل کے اندر رکھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے باہر نہ نکالوں گی تو شاید میری ہڈیاں تک جل جائیں گی اس وقت آٹھ بجے ہیں لیکن میرے رنگیلے پیا کا کہیں پتہ نہیں۔ رات کا کھانا کھا کر وہ ایک دوست سے ملنے کا کہہ کر گھر سے نکلے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے" اور کوئی یہ نئی بات نہیں ہے، ادھر کئی مہینوں سے یہ اُنکی روزمرہ کی عادت ہے، میں نے آج تک کبھی آپ سے اپنے دردِ دل نہیں کہا مگر اسوقت بھی جب میں آپ سے ہنس کر باتیں کرتی تھی، میرا دل روتا رہتا تھا اور میں آپ سے ایک دوست کی حیثیت سے پوچھتی ہوں، میرے لئے اب کونسا راستہ ہے۔ اس نے منتظر نگاہوں سے کاؤس کی طرف دیکھا۔

شیریں کی آنکھیں لبریز ہو گئی تھیں، مگر چہرے پر ایک جلال سا نمایاں تھا۔ اپنی بیکسی کا یہ اظہار اسے کتنا ناگوار گذر رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

کاؤس جی نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔ آپ نے اُن سے پوچھا نہیں۔

"پوچھنے سے کیا لوگ اپنے دل کی بات بتا دیا کرتے ہیں"۔

"تم سے انہیں کوئی بات چھپانی نہ چاہیئے"۔

"گھر سے انسان بیزار ہو تو کیا کرے"۔

"مجھے یہ سنکر حیرت ہو رہی ہے۔ تم جیسی پاکیزہ صفت خاتون جس گھر میں ہو وہ جنت ہے۔ شاپور جی کو تو تمہاری پرستش کرنی چاہیے تھی"۔

شیریں مسکرائی، ستم ظریفانہ انداز سے اس تبسم میں رازِ دل تھا۔

"آپ کے یہ جذبات اسوقت تک ہیں جبتک آپکے پاس دولت نہیں ہے

آج کہیں سے دو چار لاکھ مل جائیں تو تم ایسے نہ رہو گے۔ تمہارے دل کی یہ حالت نہ ہو۔ دولت کی سب سے بڑی نعمت یہی ہے، سطح کے سکون اور ہریالی قفل کے نیچے کتنی حرارت ہے یہ تو اسوقت کھلتا ہے جب زمین میں شگاف ہو جاتا ہے وہ سمجھتے ہیں گھر میں دولت کا انبار لگا کر انہوں نے وہ سب کچھ کر دیا جو انکا فرض تھا۔ میرے ساتھ اور اب مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں میرا زبان کھولنا بھی حق بجانب نہیں، وہ نہیں جانتے کہ یہ سارے امارات کے لوازم عصری تعلقوں میں مدفون شگفتات کیطرح ہیں جو ان تڑپنے والی روحوں کے عیش و آرام کیلئے رکھے جاتے ہیں۔

کاؤس جی آج ایک نئی بات سن رہے تھے انہیں اسوقت تک زندگی کا جو تجربہ تھا وہ یہ تھا کہ عورت طبعاً عشرت پسند اور نفس پرور ہوتی ہے اس پر لاکھ جان نثار کرو اس کیلئے مر ہی کیوں نہ مٹو لیکن جب تک تمہاری جاں نثاریوں کا کوئی عملی اظہار نہ ہو کر صرف زیورات کی صورت میں ریشمی ملبوسات کی صورت میں اسے تسکین نہیں ہوتی وہ محض کھریاں نہیں چاہتی، داد اور گھاس بھی چاہتی ہے، لیکن ایک یہ بھی دیوی ہے جو دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھتی ہے اور صرف مہر و وفا کے لئے محبت کیلئے، دل سوزی اور دلجوئی کیلئے ان کے دل میں گدگدی سی ہوئی

مسز شاپور کی آواز تلخ ہو گئی تھی اور پیشانی پر بل پڑ گئے تھے، فرد دم لیکر بولیں اُنکی یہ ہوس پروری میری برداشت کے باہر ہو گئی ہے مسٹر کاؤس جی میرے دل میں سوزش ہے ہیجان ہے اور میں دیق اور تڑپ، تنگ و تاریک میں کسی کی آہ لیکر بھی اپنے کو پابند نہیں رکھ سکتی .... عصمت کی حفاظت کس لئے جب کوئی اصلی قدر نہیں کرتا جنگل میں کیوں کوئی گائے جب کوئی سننے والا نہیں دل کو سمجھاتی ہوں کیا دنیا میں لاکھوں بیوائیں نہیں پڑی ہوئی ہیں، جوان حسین ناز و نعمت میں پلی ہوئی کیا میں انہی کیطرح یاس اور محرومی قسمت کا دامن پکڑ کر زندگی کی منزل طے نہیں کر سکتی۔ لیکن دل کی آگ نہیں بجھتی، اب مجھے یقین آ جاتا ہے کہ شاپور مجھ سے وہ محبت

کچھ ایک گریڈ لانے کی تحریک کر رہے ہیں دیدہ دانستہ شاید کسی خاص منشا سے میں نے اب تک اُن کی چھوٹی منظور نہیں کی ہے لیکن پانی سر کے اوپر چڑھ گیا ہے اور میں کسی تنکے کے سہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا نہیں اس سے کچھ زیادہ ہوگا، ناموس کی زنجیر سے آزاد ہو کر آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا آپ ان کے دوست ہیں آپ سے بن پڑے تو انہیں سمجھائیے میں اس عصمت کی بیڑی کو اب اور نہیں پہن سکتی مسٹر گاڈس جی آنیوالی مسرتوں کی ایک جنت بنا رہے تھے لیکن یہ فقرہ روحانی خوشیوں سے پُر بولے ہاں ہاں میں ضرور سمجھاؤں گا، یہ تو میرا فرض ہے لیکن مجھے اُمید نہیں کہ میرے سمجھانے کا ان پر کوئی اثر ہو جس کے پاس دولت نہیں اُسے ایک صاحبِ دولت کو سمجھانے کا حق ہی کیا ہے آپ کا خیال درست ہے ضرور انہوں نے کسی منشا سے یہ روش اختیار کی۔

”یوں تو وہ مجھ پر بڑی عنایت رکھتے ہیں، میری خاطرداری میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھتے ان کی یہی عادت مجھے پسند نہیں۔“

”تم نے اتنے دنوں تحمل سے کام لیا یہی وجہ تعجب ہے کوئی دوسری خاتون ایک دن بھی برداشت نہ کرتی۔“

”اُن کے ساتھ زیادہ سختی نہ کیجیے مسٹر گاڈس جی یہ عادت تو کم و بیش ہر مرد میں ہوتی ہے لیکن ایسے مردوں کی بیویاں بھی اسی مزاج کی ہوتی ہیں اور عموماً معاوضہ لینے پر آمادہ کر لیتی ہیں وہ اپنے اپنے رنگ میں خوش رہتے ہیں گلہ نہیں ہوتا، دلاور دل ہوتی ہیں، میں نہ پہلے سے کچھ کہہ سکتی ہوں کہ میری حالت بالکل مختلف ہے میں نے ہمیشہ اپنا معبود سمجھا ہے۔“

”لیکن مرد اس وفادار تسلیم کی قدر ہی نہ کرے تو مجبوری ہے مجھے اندیشہ ہے انہوں نے دل میں کوئی اور تہیہ نہ کر لیا ہو۔“

”اور کیا تہیہ نہ کر لیا ہو“

”کیا آپ ان کا قیاس نہیں کر سکتیں؟“

"اچھا، وہ بات، لیکن میری کوئی خطا؟"

"شیر اور ٹیٹے والی کہانی کیا آپ نے نہیں سنی؟"

مسز شاپور یکایک خاموش ہو گئیں، سامنے سے شاپور جی کی کار نظر آئی، انہوں نے کاؤس جی کو ممنوں اور ملتجی بنا ہوا دیکھا اور دوسرے دروازہ سے نکل کر اندر چلی گئیں۔ مسٹر شاپور جی آنکھوں میں خمار کی سرخی اور سستی بھرے ہوئے کار سے اُترے اور مسکرا کر کاؤس جی سے ہاتھ ملایا اور اپنا ہیٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا معاف کیجئے گا میں رات ایک دوست کے گھر رہ گیا۔ دعوت تھی، کھانے میں دیر ہوئی کچھ گانے بجانے کا بھی انتظام تھا۔ میں نے سوچا اب کون گھر جائے۔" کاؤس جی نے طنز آمیز تبسم کیساتھ پوچھا کس کے ہاں دعوت تھی، میرے رپورٹر نے اسکی کوئی خبر نہیں دی۔ ذرا مجھے نوٹ کرا دیجئے گا۔

انہوں نے جیب سے نوٹ بک نکالی۔

شاپور جی نے سنبھل کر کہا ایسی کوئی بڑی دعوت نہیں تھی دو چار بے تکلف احباب جمع ہو گئے تھے۔

"پھر بھی اس کی خبر اخباروں میں آنی چاہیئے جس بے تکلف جلسے میں آپ جیسے باوقار احباب شریک ہوں اُسے اخبار والے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں اور عوام کو بھی ایسی خبروں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے میزبان کون صاحب تھے؟

شاپور جی نے ایک معنی تبسّم کے ساتھ پوچھا "آپ چونکیں گے تو نہیں"

"فرمائیے تو۔"

"مس گوہر"

"مس گوہر"

"جی ہاں وہی آپ چونکے کیوں کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دن بھر کے دردِ سر کے بعد مجھے تازہ ہونے کیلئے کچھ تفریح کی بھی ضرورت ہے ورنہ یہ زندگی عذاب ہو جائے۔

کاؤس جی نے زاہدانہ استحکام کے ساتھ کہا: میں اسے نہیں مانتا۔

"کیوں؟"

اس لئے کہ میں کسی قسم کی نفسیاتی تفریح کو اپنی سنگ دلی کیسا تعصب بے انصافی سمجھتا ہوں شاپور جی جیسے ایک پر معنی انداز کے ساتھ بولے "دقیانوسی خیالات ہ"

کاؤس جی نے جوش کے ساتھ کہا: آپ کو واضح ہونا چاہیئے کہ آج کی تہذیب نسل پچھلے کی تہذیب سے کہیں زیادہ قرین قیاس ہے اب عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال نہیں کئے جا سکتے اب عورت کو مرد سے باز پرس کرنے کا حق ہے۔"

"بالفاظ دیگر، اب عورتیں مردوں پر حکومت کر سکتی ہیں۔"

"اس طرح جیسے کہ مرد عورتوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔"

"میں اسے نہیں مانتا، مرد عورت کا محتاج نہیں ہے عورت مرد کی محتاج ہے۔"

"آپکا مطلب یہی ہے نا کہ عورت اپنی گزر اوقات کیلئے مرد کی دست نگر ہے۔"

"اگر آپ اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ اختیار کی عنان سیاست کیطرح دنیات میں بھی ہمیشہ مرد کے ہاتھ رہی ہے اور رہیگی۔"

کاؤس جی اس مسئلہ پہ بہت لکھ پڑھ چکے تھے اور اسکے ہر پہلو پر غور کیا تھا بولے "اس اعتبار سے تو اگر خدانخواستہ کسب معاش کا یہ جورت اختیار ہی ہو تو اسے بھی اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تفریح کر سکے، آپ کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔"

شاپور جی کی زندہ دلی نے متانت کی صورت اختیار کی۔

"میں عورت کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا۔"

"تو یہ آپ کی سراسر بے انصافی ہے۔"

"مطلق نہیں عورت پر فطرت نے ایسی قیدیں عائد کر رکھی ہیں کہ وہ بجد امکان کوشش کرنے پر بھی مرد کیطرح مطلق العنان نہیں رہ سکتی اور نہ حیوانی طاقت ہی مرد کا مقابلہ کر سکتی

ہے جہاں نسائیت کو ترک کر کے اور غیر فطری زندگی کی حمائیت میں جا کر وہ سب کچھ کر سکتی ہے اور آج بھی لاکھوں کروڑوں عورتیں اس آزادانہ روش پر چل رہی ہیں۔

"آپ لوگ اسے مجبور کر رہے ہیں وہ نسائیت ترک کر کے یہ آزادانہ روش اختیار کرے"

"میں اس آنیوالے زمانہ کا قیاس بھی نہیں کر سکتا جب مردوں کی حکومت اور فضیلت کو تسلیم کرنیوالی عورتوں کا قحط پڑ جائے۔ قانون اور تہذیب سے بحث نہیں میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ مردوں نے عورتوں پر ہمیشہ راج کیا ہے اور کریں گے"

دفعتاً گاڈمن جی نے پہلو بدلا، اتنی تھوڑی سی دیر میں ترغیب نفس نے ان پر تسخیر کا عمل شروع کر دیا تھا شاپور جی کو تحسین کی نظروں سے دیکھ کر بولے تو اس معاملہ میں میں اور آپ دونوں ہم خیال ہیں، میں صرف آپکی تھاہ لے رہا تھا میں عورت کو بیوی، ماں بہن کی صورت ہی میں دیکھ سکتا ہوں، اسے مطلق العنان نہیں دیکھ سکتا اگر کوئی عورت آزاد رہنا چاہتی ہے تو اسے میرے نظام تمدن میں کوئی جگہ نہیں ہے ابھی مسز شاپور کی باتیں سنکر میں حیرت میں آگیا مجھے اسکا خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ کوئی عورت اتنے فاسد خیالات کو دل میں جگہ دے سکتی ہے شاپور کی گردن کی رگیں تن گئیں، نتھنے پھول گئے آنکھیں مشتعل ہو گئیں، تنفس تیز ہو گیا کرسی سے اٹھکر بولے "اچھا تو شیریں نے اب یہ پر نکالے ہیں میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں۔ آپ کے روبرو پوچھتا ہوں، ابھی فیصلہ کر ڈالتا ہوں مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کسی کی پرواہ نہیں ہے بیوفا عورت تنگ نظر، کوربا طن، جس کے دل میں ہمدردی کا شائبہ تک نہیں جو میری تاریک زندگی میں روشنی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتی جو مجھے زندگی کی جگر کاویں سے ایک لمحہ بھی مہلت نہیں دینا چاہتی کیا وہ چاہتی ہے کہ میں ہمیشہ اسکے آنچل سے بندھا بندھا گھوموں شاپور سے وہ یہ امید رکھتی ہے بیوقوف بھول جاتی ہے کہ ذرا سا آنکھ کا اشارہ کر دوں تو ایک سو شیریاں آ کر نازبرداری کرینگی جی ہاں غیر تو سے سہلائیں میں نے اس کیلئے جو کچھ کیا شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت کے ساتھ کیا ہوگا۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے۔۔۔

انہیں معاً خیال آیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بہکے جا رہے ہیں شیریں کی وہ محبت

آمیز قربانیاں، وہ بے نفس خواہشیں یاد آگئیں۔ ضبط کر کے بولے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی سمجھ سے کام لے سکتی ہے میں اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ احباب سے میری شکایت ہے۔ اتنا مجبوری کا اظہار اس سے آگے تو قدم اٹھانے کی حماقت سرزد نہیں ہو سکتی اس کی غیرت قبول نہ کرے گی میں ایسے مثالوں کا عادی ہوں کا منا لینا بہت مشکل ہے کم سے کم مجھے تو یہی تجربہ ہے۔

کاؤس جی نے تردید کی، میرا تجربہ تو کچھ اور ہے۔

"ممکن ہے لیکن آپ کے پاس خالی خولی باتیں ہیں میرے پاس دولت کا تریاق ہے"

"انحراف کا اثر تریاق سے رد نہیں ہو سکتا۔"

شاپور جی نے خطرہ کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کر کے کہا شاید آپ کا خیال درست ہو۔ کئی دنوں کے بعد کاؤس جی کی ملاقات شیریں سے ہوئی، پارک میں وہ اسی موقع کے منتظر تھے ادھر وہ شیریں کے گھر نہ گئے تھے اندیشہ تھا شاپور جی بدگمان نہ ہو جائیں۔ ان کی محبت تعمیر ہو چکی تھی اس میں صرف شیریں کو مسند پر بٹھانے کی کسر تھی، اس روز سعید کے تصور میں وہ پاگل ہو رہے تھے بالکل یہی تجربہ تھی کہ اس محبت کی بنیادیں بالوں پر ہیں یا پانی پر ہیں۔ امید کامیاب دیکھ کر بڑے دانا بھی شیخ چلی ہو جاتے ہیں گلشن کو انہوں نے میکے بھیج دیا تھا بھیج کیا دیا تھا وہ روٹھ کر چلی گئی تھی جب شیریں ان کی محبت اور بے سروسامانی قبول کر رہی ہے تو گلشن کی ناز برداری کیوں کی جائے لپک کر شیریں سے ہاتھ ملایا اور بولے آپ خوب ملیں، میں تو آج آنے والا تھا شیریں نے شکایت کی آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں، شاید آپ بھی زبانی ہمدردی ہی کرنا جانتے ہیں آپ کو کیا خبر ان دنوں میری آنکھوں سے کتنے آنسو بہے۔

کاؤس جی نے شیریں کا وہ حسین چہرہ اشتیاق چمکتا ہوا اور التجا سے زیادہ شکن دیکھا تو ان کا دل اندر سے بیٹھتا ہوا معلوم ہوا اس طالب علم کی سی حالت ہوئی جو آج تعلیم کی آخری منزل طے کر چکا ہو، زندگی کا مسئلہ اپنی خوفناک صورت میں اس کے سامنے کھڑا ہو کاش وہ کچھ دن اور امتحان

کی بھول بھلیاں میں زندگی کے میٹھے سنہرے خوابوں کا لطف اٹھا سکتا اس خواب کے سامنے یہ حقیقت کتنی دلشکن تھی کتنی ہمت شکن ابھی تک کاوس نے مہا مکھی کا شہد ہی چکھا تھا۔ اس وقت وہ انکے چہرہ پر سنسناہٹ ہی تھی اور وہ ڈر رہے تھے، کہیں ڈنک نہ مار دے لیکن ہولی آواز سے بولے۔ "مجھے یہ سن کر دلی صدمہ ہوا۔ میں نے تو شاپور کو بہت سمجھایا تھا۔ شیریں نے انکا ہاتھ بے تکلفی سے پکڑ کر ایک بنچ پر بٹھا دیا اور آنکھوں میں اصرار اور التجا بھر کر بولی ان پر اب سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوگا اور مجھے ہی کیا غرض پڑی ہے کہ میں انکی خوشامد کرتی پھروں آج میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب لوٹ کر اس گھر میں نہ جاؤں گی، اگر انہیں عدالت میں ذلیل ہونیکا شوق ہے تو مجھ پر حق شوہریت کا دعوی کریں۔ میں تیار ہوں میں جس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں اسکے ساتھ رہنے کیلئے خدا بھی مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ عدالت کیا چیز ہے اگر تمہارے دل میں وہ خلوص اور محبت ہے جسکا تم اشاروں میں بارہا اظہار کر چکے ہو اور جسے میں نے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے جسے میں نے پیغام سمجھا ہے تو آج سے میں تمہاری بن کر رہنے کو تیار ہوں جبتک تم میرے رہو گے میں دولت کی بھوکی نہیں، میں تم سے صرف وفا اور محبت چاہتی ہوں لیکن اگر تم میں اتنی اخلاقی ہمت نہیں ہے تو میرے لئے وسیع دنیا ہے، میں جیسی کچھ بھی ہوں اتنا جانتی ہوں کہ میرے قدردانوں کی کمی نہیں ہے۔ صاف صاف بتاؤ کیا وہ ساری [illegible] زبانی تھیں۔ کاوس جی نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا

"نہیں نہیں شیریں خدا جانتا ہے، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں تم میری جنت کی دیوی ہو، میری زندگی کا روشن ستارہ ......

"زیادہ لفاظی نہیں۔ گلشن کیا کرو گے؟"

اسے طلاق دے دوں گا۔"

ہاں میں یہی چاہتی ہوں اور مجھے اس کا افسوس نہیں ہے میں اس کا بنا بنایا آشیانہ برباد نہیں کر رہی ہوں۔ میں صرف اپنے آشیانہ کو آباد کر رہی ہوں جسکی اس نے کبھی قدر نہیں کی" تو تمہارے ساتھ چلی گئی، اسی وقت خوب منتج لیا شاپور سے اب میرا کوئی تعلق نہیں نہ دین کا نہ دنیا کا۔

کاؤس جی کو اپنے دل میں رعشہ کا احساس ہوا گو یہ گدی نہیں تھی رعشہ تھا لرزہ کپکپی، بولے لیکن ابھی تو میرے گھر میں کوئی تیاری نہیں ہے۔

شیریں نے بنچ سے اُٹھ کر گویا دریا میں کودتے ہوئے کہا میرے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں، تم سب کچھ ہو۔ ایک ٹیکسی لے لو، میں اسی وقت چلونگی تمہارے گھر سے شاپور کو ایک رقعہ لکھ دوں گی۔ تم مجھ سے سیر ہو گئے اس لئے میں جاتی ہوں پھر نہ آؤں گی۔

کاؤس جی ٹیکسی کی تلاش میں پارک سے نکلے وہ اس مسئلے پر غور کرنے کیلئے لئے تھوڑی سی مہلت چاہتے تھے اس بہانے سے وہ دولت مل گئی اب ان پر جوانی کا وہ نشہ تھا جو کبھی کبھی ہمیں گڑھوں میں گرا دیا کرتا ہے۔ ذلت کے، رسوائی کے۔ اگر کچھ نشہ ہوا بھی تو ہرن ہو چکا تھا بیشک انہیں پریشانی ہوگی، تباہی کے سامان بھی ہو سکتے ہیں اور رسوائی کے بھی۔ شاپور جی ان کے قاتل دشمن ہو جائینگے۔ اور انہیں خاک میں ملا دینے کیلئے اپنی ثروت اور اختیار کے سارے وسائل کام میں لائینگے گلشن بھی خاموش بیٹھنے والی نہیں وہ گلی گلی کوچے کوچے میں رسوا کرے گی۔ اخباروں میں کہرام مچ جاویگا حریفوں کی قسمت جاگ اُٹھیگی اسواقعہ کو جلی سرخیوں سے شائع کرینگے بوالہوسی کے کرشمے ایک شکاری ایڈیٹر کی رنگین مزاجی، نئی تہذیب کا دیوالہ وغیرہ مگر یہ سب مصیبتیں جھیلنے کیلئے وہ تیار تھے۔ شاپور جی کی زبان بند کرنے کیلئے اُنکے پاس کافی دلیلیں تھیں، شہادتیں تھیں، گلشن کو بھی طبقۂ اناث میں ذلیل کر سکتا اُنکے پاس کافی سامان موجود تھا شیریں جیسی پاک نفس عورت کیلئے وہ اس سے کہیں سخت آزمائش کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے خوف تھا تو یہ کہ شیریں کی اس محبت میں قیام بھی ہے۔ ابھی تک شیریں نے انہیں انصاف نیت اور حق کے وکیل کی نظر سے دیکھا ہے قرآن کے بیدار مغز از مضامین پڑھے ہیں، صرف اُن کی تحرا اور ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں سنی ہیں اگر شیدائی ہیں تو انہیں شاپور سے کسی قسم کا اندیشہ تھا۔ اخلاقی اوصاف میں شاپور ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن ان کی شرافت ذکاوت کا وہ رنگ انکی بے سر و سامانی اور بدحالی میں کچھ عرصہ تک قائم رہیگا۔ اس میں انہیں شک تھا جلوے

گی جگہ چپڑی روٹیاں بھی ملیں تو آدمی صبر کر سکتا ہے روکھی بھی مل جائے تو ...... شاید وہ قناعت کرے لیکن سوکھی گھاس سامنے دیکھ کر فرشتے بھی جامے سے باہر ہو جائینگے۔ شیریں کو ان سے محبت ہے اسمیں شک نہیں۔ لیکن محبت کی قربانی کی بھی کوئی حد ہے وہ چار دن یا دو مہینے تو شعریت کے نشے میں وہ خاموشی سے کاٹ لیگی لیکن شعریت اور کیف قائم رہنے والی چیزیں تو نہیں حقیقتوں کی یورش کے مقابلہ میں شعریت کتنے دن کٹے گی اس چھیچھا لیدر کا تصور کر کے وہ کانپ اٹھے۔ ابتک وہ محل میں رہی ہے اب اسے پھونس کی جھونپڑی میں بیٹھنا ہوگا۔ جس کے فرش پر ایرانی قالینوں کی جگہ ٹاٹ بھی نہیں، کہاں وردی پوش ملازموں کی پلٹن، کہاں ایک بڑھیا ماں کی کج بحثیاں، جو بات بات پر جھنجھلاتی ہے کوستی ہے اور چھوڑ کر چلی جانیکی دھمکی دیتی ہے ان کی آدھی آمدنی تو موسیقی ماسٹر کی نذر ہو جائے گی جو اُسے گانا سکھانے آتا ہے اور کہیں شاپور جی نے سفلہ پن سے کام لیا تو انہیں بدمعاشوں سے پڑا کے میں قتل کرا سکتے ہیں پھر ان باتوں سے وہ نہیں ڈرتے یہ تو انکی فتح ہوگی، لیکن شیریں کی نفاست پسندی اور شوق خود پر کیسے فتح پائیں، بڑھیا ماں جب منہ پھیلائے آکر اسکے سامنے روٹیاں اور سالن رکھے گی، چاندی کے ظروف میں نہیں، چینی کی طشتریوں میں تب شیریں کے شگفتہ چہرے پر کیسی مظلوم مایوسی طاری ہو جائے گی۔ کہیں وہ اس برانگیختگی کے عالم میں ان کو وہ اپنی قسمت کو کوسنے نہ بیٹھنے لگے شوہروں کی کمی نازبرداریوں سے نہیں پوری کی جا سکتی۔

دفعتاً سامنے سے ایک کار نظر آئی کاؤس جی نے دیکھا، شاپور جی رونق افروز تھے انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر کار کو روک لیا اور پیچھے دوڑتے ہوئے آکر شاپور جی سے بولے۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"یوں ہی ذرا گھومنے نکلا ہوں۔"

"شیریں بانو پارک میں ہیں انہیں لیتے جائیے۔"

"وہ تو مجھ سے لڑ کر آئی ہیں کہا ہے گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔"

"اور آپ سیر کرنے جا رہے ہیں۔"

"تو کیا بیٹھ کر رو دوں۔"

"بہت رو رہی ہیں۔"

"ہمدردی کرنے کو تو آپ ہی ہیں۔"

"آپ انہیں منائیں، ذرا اُنکے آنسو پونچھیں وہ ضرور آپکے ساتھ چلی جائینگی۔"

"میں امتحان لینا چاہتا ہوں کہ وہ بغیر منائے مانتی ہیں یا نہیں۔"

"میری جان بڑے عذاب میں ہے، آپ مجھ پر رحم کیجئے آپکے پیر دل پڑتا ہوں۔"

"شیریں جیسی حسینہ کو اپنی حمایت میں لینا عذاب نہیں ہے جناب نہایت خوشگوار فرض ہے، اور بہت سہی کے بات آپکو یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔ ہم تو روٹھنے منانے کے تماشوں میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا، ہمکا بھی ایک زمانہ تھا مگر مدت ہوئی ہے بزم چراغاں کئے ہوئے۔"

کار چل دی اور کانڈ مس جی تحیر کی حالت میں وہیں کھڑے رہ گئے۔ دیر ہو رہی تھی سوچنے لگے کہیں شیریں یہ نہ سمجھنے لگے کہ اُنہوں نے بھی اسکے ساتھ دغا کی۔ لیکن جائیں کیسے اس امیرزادی کو اپنی اس سنسان کٹیا میں لیجانے کا خیال ہی انہیں مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ حیرت یہی تھی کہ پہلے یہ خیال اُنکے دل میں کیونکر آیا۔ وہ کٹیا تو اسی لئے ہے کہ ایک ایڈیٹر عابدانہ محویت کے ساتھ حق اور انصاف اور آزادی کی پرستش کرے۔ امارت اور نفاست کیلئے وہاں جگہ کہاں؟ بلبل کیلئے تو گلشن چاہئے، ویرانے میں اس کی دلچسپی کے سامان کہاں۔ اس کٹیا کیلئے تو گلشن ہی موزوں ہے، کُڑھتی ہے کوستی ہے مچلاتی ہے، روتی ہے، لیکن وقت پر کھانا تو دیتی ہے پھٹے ہوئے کپڑوں پر پیوند کر دیتی ہے، کوئی مہمان آجاتا ہے تو خندہ پیشانی سے اس کی خاطر و تعظیم کرتی ہے کوئی چھوٹی سی سوغات بھی دیدو تو کتنی خوش ہو جاتی ہے تھوڑی سی تعریف کرکے چاہے اس سے غلامی کرالو۔ اب انہیں اپنا ذرا ذرا سی بات پر جھنجھلا پڑنا اسکی سیدھی باتوں کا ٹیڑھا جواب دینا، شیریں کی ثروت کی نظروں میں اُسے ذلیل کرنا یاد آنے لگا اُنکی حق پرستی اور عالی نفسی کیا محض تحریر کیلئے وقف ہے محض اُن کیلئے جو اُن سے خود ہی بے تعلق ہیں۔ اسدن گلشن نے یہی تو کہا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کی سالگرہ کے موقع پر کوئی تحفہ بھیجنا چاہئے۔ اسمیں برس پڑنے کی کونسی بات تھی مانا وہ ادارتی مقالہ

لکھنے میں محو تھے لیکن ان کیلئے ادارتی مقالہ جتنا اہم اور ضروری ہے کیا اتنا ہی یا اس سے زیادہ ضروری اور اہم گلشن کیلئے تحفہ بھیجنا نہیں ہے بیشک اُنکے پاس روپے نہیں تھے۔ اسوقت معمولی سوغات سے گلشن کی تسکین نہ ہوتی لیکن میٹھے الفاظ میں وہ یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ ڈارلنگ مجھے افسوس ہے اسوقت میں تنگدست ہوں لیکن دو چار روز میں کوئی انتظام کردوں گا۔ یہ سُنکر وہ خاموش ہو جاتی ان کا کیا بگاڑ سکتی تھی ترک موالات تو نہ کر بیٹھتی۔ اپنے مقالات اور مضامین میں بھی وہ کتنی ملاحت و فصاحت اور خوش بیانی سے کام لیتے تھے۔ ایک بھی دل آزار کلمہ ان کے قلم سے نہ نکلتا تھا۔ دنیائے فصاحت میں اُن کا قلم اپنی لطافت کیلئے مشہور تھا لیکن اس خوف خوف سے کہ وہ گورنمنٹ اور پبلک دونوں ہی سے ڈرتے تھے جانتے تھے کہ ذرا بھی سخت کلامی کی تو گردن ناپی گئی اُن کے آبائی صفات میں غصہ اور ہٹ دھرمی بہت بڑے گناہ تھے پھر وہ گلشن پر کیوں برہنہ شمشیر کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ کیا اس لئے کہ وہ اُن کی دست نگر ہے اور روٹھ جانے کے سوا انہیں اور کوئی سزا نہیں دے سکتی کتنی کمینہ خود غرضی ہے کہ وہ اقتدار اور اختیار والوں کے سامنے دم ہلائیں اور جو ان کیلئے اپنی زندگی قربان کرسکتی ہے اور کرتی ہے اُسے کاٹنے دوڑیں۔ انکا دھیان اس تانگہ کیطرف گیا جو یکایک سامنے رُک گیا تھا کہنے لگے بدمعاش ہوتے ہیں یہ تانگے والے اندھا دھند دوڑا چلا جاتا ہے۔ اچھا اس پر تو کوئی لیڈی صاحبہ سوار ہیں۔ خیال "آپ کو تانگے پر کار کا لطف اُٹھانے کا خبط ہوا ہوگا۔ ارے یہ تو گلشن ہے ہاں وہی ادھر ہی طرف آرہی ہے۔ انہوں نے تپاک سے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا اور بولے تم اس وقت یہاں کیسے آئیں میں ابھی ابھی تمہارا ہی خیال کر رہا تھا۔

گلشن نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "تمہارے ہی پاس آرہی تھی اخبار لیکر برآمدے میں بیٹھی تمہارا مقالہ پڑھ رہی تھی کہ نہ جانے کب جھپکی آگئی اور میں نے ایک دہشتناک خواب دیکھا۔ مارے خوف کے آنکھ کھل گئی اور تم سے ملنے چل پڑی دل بےچین ہو رہا تھا۔ تم اسوقت یہاں کیوں کھڑے ہو۔ کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا۔ میرا سینہ دھک دھک کر رہا ہے ہاتھ رکھ کر دیکھو۔

کلثوم جی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، میں تو خدا کے فضل سے بہت اچھی طرح ہوں کیا خواب دیکھا تم نے؟

میں نے دیکھا جیسے تم ایک عورت کے پیروں پر سر رکھے ہوئے اور وہ تمہیں پائے حقارت سے ٹھکرا رہی ہے۔

"کتنا بیہودہ اور مہمل خواب ہے اور تمہیں اس پر یقین آگیا میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ خواب محض فکر دل کے اوہام ہیں۔"

"گلشن نے انکی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھا، تم مجھ سے چھپا رہے ہو کوئی نہ کوئی بات ہوئی ضرور ہے، اچھا تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو، یہ تو تمہارے لکھنے کا وقت ہے۔"

"یونہی ذرا گھومنے چلا آیا تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو کھاؤ میرے سر کی قسم:"

"اب تمہیں اعتبار نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔"

"قسم کیوں نہیں کھاتے؟"

"قسم کو میں کذب کی تائید سمجھتا ہوں۔"

"گلشن نے پھر انکے چہرے پر متجسس نگاہ ڈالی، پھر ایک لمحہ کے بعد بولی۔

"اچھی بات ہے چلو گھر چلیں۔"

کلثوم جی نے مسکرا کر کہا، تم مجھ سے پھر لڑائی کرو گی۔

"گلشن نے برجستہ کہا، سرکار سے لڑکر بھی ہم سرکار کی عملداری میں رہتے ہو کہ نہیں"

"ہم اسے کب مانتے ہیں کہ یہ سرکار کی عملداری ہے۔"

"یہ تو محض زبان سے کہتے ہو، تمہارا رواں رواں اسے تسلیم کر رہا ہے، ورنہ تم اس وقت جیل میں ہوتے۔"

"اچھا تم چلو، میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔"

"میں اکیلی نہیں جانے کی، آخر سنو، تم یہاں کیا کر رہے ہو۔"

کاؤس جی نے بہت کوشش کی کہ گلشن یہاں سے کسی طرح چلی جائے، لیکن وہ جتنا ہی اس پر زور دیتا تھا اتنی ہی گلشن اور ضد پکڑتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر کاؤس جی کو شاپور اور شیریں کی خانہ جنگیوں کی داستان کہنی پڑی ہاں اس ناٹک میں اس کا اپنا جو حصہ تھا اسے اس نے بڑی ہوشیاری سے چھپا دینے کی کوشش کی۔

گلشن نے الہامی انداز سے کہا "تو تمہیں یہ عذاب بھی سوار ہوا۔"

کاؤس جی نے اپنی صفائی دی، کیسا عذاب میری اسمیں کیا خطا؟

"تم کیوں بیچ میں پڑے" "آخر شیریں نے تم سے کیوں داد خواہی کی"

"اب یہ انسانیت نہیں ہے کہ ایک دوست کی بیوی مجھ سے فریاد کرے اور میں بغلیں جھانکتا پھروں۔"

گلشن نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ جھوٹ بولنے کیلئے بڑی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔ پیارے اور وہ عقل تم میں نہیں ہے، سمجھے تم اپنا اخبار لکھے جاؤ اور حق و انصاف کے نعرے لگائے جاؤ ان خانہ جنگیوں میں پڑ کر تمہاری زندگی تلخ ہو جائیگی۔ اور تمہارے ساتھ میری بھی۔ چپکے سے جا کر شیریں بانو کو سلام کرو اور کہو کہ جا کر اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیں مسرت کامل کا دنیا میں وجود نہیں مشیت اتنی بے انصافی نہیں کر سکتی جسطرح غم میں کچھ خوشی ہوتی ہے اسی طرح خوشی میں کچھ غم بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر مسرت کا لطف اٹھانا ہے تو اس کے کانٹوں اور دلعتوں اور خامیوں کے ساتھ اٹھانا پڑے گا، ابھی سائنس نے کوئی ایسی ایجاد نہیں کی جس سے ہم مسرت کو اسکے کانٹوں سے علیحدہ کر سکیں مفت کا مال اڑانے والوں کو عیاشی کے سوا اور کیا میسر آئے گا؟۔

دولت اگر ساری دنیا کی لذتوں کو خریدنا چاہے تو وہ دولت ہی کیسی اجتناب میسر نہیں ہو سکی، ابھی نہیں، کیا شیریں کیلئے بھی وہی دروازے نہیں کھلے ہیں جو شاپور جی کیلئے کھلے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔ اس سے کہو شاپور جی کی چھاتی پر مونگ دلے انکی دولت سے حظ اٹھائے

اور بھول جائے کہ وہ شاپور جی کی بیوی ہے اسی طرح جیسے شاپور بھول گیا ہے۔ وہ شوہر کا شوہر بنے، حیا اور کردار چھوڑ کر وقت کے مزے لوٹے اسکی دولت ایک سے ایک حسین اور رنگین مزاج نوجوان کو کھینچ لائے گی۔ تم نے ہی کہا تھا کہ ایک زمانہ میں فرانس میں باثروت اور عیاش عورتوں کا سارے سماج پر راج تھا، ان کے شوہر سب کچھ دیکھتے تھے اور منہ نہ کھول سکتے تھے اور خود اسی دھن میں مست تھے، یہی دولت کا فیض ہے آج سے نہیں ازل سے تم سے نہ بنے تو چلو میں شیریں کو سمجھا دوں۔ عیاش مرد کی بیوی اگر عیاش نہ ہو تو یہ اس کی بے حسی اور بے شرمی ہے۔

کاؤس جی کیلئے یہ فلسفہ بالکل اچھوتا تھا گلشن کی ذکاوت نے کبھی اتنی اونچی پرواز نہ کی تھی حیرت میں آ کر بولے، لیکن تم بھی دولت کے پرستاروں میں ہو۔

گلشن نے شرمندہ ہو کر کہا" یہی تو میری زندگی کی لعنت ہے، ہم ایسی چیز پر لپکتے ہیں جو ہمیں جہنم اور بربادی کیطرف لے جاتی ہے۔ میں پاپا کے ساتھ عرصہ تک دیہات میں رہی ہوں وہاں چاروں طرف مزدور اور کسان رہتے تھے بچارے دن بھر پسینہ بہاتے تھے شام کو جیسے مر جاتے عیاشی اور بدمعاشی کا کہیں نام نہ تھا اور یہاں میں شہر میں دیکھتی ہوں کہ سبھی بڑے گھروں میں یہی رونا ہے سبھی لوگ ہتھکنڈوں سے پیسے کماتے ہیں بے محنت و مشقت اور غیر فطری زندگی بسر کرتے ہیں انہیں عیاشی نہ سوجھے تو کیسے سوجھے۔ اگر آج ناگہاں ہیں سے دولت مل جائے تو تم بھی شاپور بن جاؤ گے۔ یقیناً۔

کاؤس جی نے شرارت سے پوچھا، تب شاید تم بھی یہ نیا طرز عمل اختیار کرو گی۔

گلشن نے متبسم آنکھوں سے دیکھ کر کہا، "شاید نہیں یقیناً۔"

بڑے بھائی صاحب

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ لیکن صرف تین درجے آگے انہوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا جب میں نے شروع کیا لیکن تعلیم جیسے اہم معاملہ میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا وہ بڑے تھے، میری عمر نو سال تھی۔ وہ چودہ سال کے تھے۔ انہیں میری تنبیہہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اس میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے، ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے تھے اور شاید دماغ کو آرام دینے کیلئے کبھی کتاب پر کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتوں، بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے تھے کبھی کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوشخط حروف میں نقل کرتے کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا نہ کوئی معنی۔ مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں میں نے یہ عبارت دیکھی، اسپیشل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں، دراصل بھائی بہن۔ رادھے شیام، شری جت رادھے شیام، ایک گھنٹے تک، اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا، میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس عبارت سے

کوئی معنی نکالوں لیکن ناکام رہا اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی، وہ نویں جماعت میں تھے، میں پانچویں جماعت میں تھا ان کی تحریر سمجھنا میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا، ایک گھنٹہ بھی کتاب لیکر بیٹھنا بار خاطر تھا موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آجاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا، کبھی کاغذ کی تیلیاں اڑاتا اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا۔ کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر نیچے کود رہے ہیں۔ کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا کہاں تھے؟ اسکا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا، نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعتراف گناہ سمجھی جاتی۔ اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے جلے لہجہ میں کہتے اس طرح انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے رہو گے اور ایک حرف نہ آئیگا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ جو چاہے پڑھ لے اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے تب جاکے کہیں انگریزی آتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ تم اتنے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے، میں کتنی محنت کرتا ہوں، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمہارا قصور ہے تمہاری عقل کا قصور ہے۔ اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا۔ روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں میں قریب نہیں پھٹکتا، ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں، اس پر بھی دو دو تین تین سال تک ایک ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں، پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں تم ساری زندگی اسی درجے میں سڑتے رہو گے اگر تمہیں اسطرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سنکر آنسو بہانے لگتا جواب ہی کیا تھا۔ بھائی صاحب کو نصیحت

کے فن میں کمال تھا ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا اور ذرا دیر کیلئے مجھ پر مایوسی آجاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں جو کام میرے بوتے کے باہر ہے اسمیں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اسکے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرنا ٹائم ٹیبل بنانا، صبح اٹھنا، منہ دھو کر ناشتہ کرنا، پھر انگریزی مطالعہ سات آٹھ بجے تک حساب آٹھ سے نو بجے تک تاریخ نو سے ساڑھے نو تک کھانا کھا کر اسکول جانا، ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس آکر آدھ گھنٹے تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر آدھ گھنٹہ آرام چھ سے ساڑھے آٹھ تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو بجے تک انگریزی، نو سے دس تک اردو، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔

مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی، اس پر عمل کرنا دوسری بات، پہلے ہی دن سے اسکی خلاف ورزی شروع ہو جاتی۔ میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دلاویز ہریالی وہ پر لطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی، اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں ان کے سایہ سے بھاگتا تھا انکی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا مگر میں اسطرح دبے پاؤں آتا کہ انہیں خبر نہ ہو ان کی نظر میری جانب اٹھتی اور میری روح فنا ہو جاتی ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی ہوئی معلوم ہوتی کتابوں سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

(۲)

سالانہ امتحان ہوا، بھائی صاحب فیل ہو گئے، میں پاس ہو گیا، اور درجہ میں اول آیا میرے اور ان کے درمیان صرف دو دو برسوں کا تفاوت ہو گیا۔ جی میں آیا بھائی صاحب کو آڑے ہاتھوں لوں، آپکی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی، مجھے ان سے بھی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی اسقدر پژمردہ شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہوئی۔

اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی خطرناک معلوم ہوا۔ ہاں اب مجھے ان پر کچھ اعتماد پیدا ہوا، اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا۔ اگر انہوں نے پھر نصیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کون سا تیر مار لیا ہے، میں تو کھیلتے کودتے درجہ میں اوّل آ گیا، زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی میرے تیور سے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں۔ بھائی صاحب نے اُسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجہ اوّل میں آ گئے تو اب تمہارے دماغ ہو گئے مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا تمہاری کیا ہستی ہے۔" تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہوگا اس کی زندگی تم آخر کیا نتیجہ نکالا۔ یوں ہی پڑھ گئے محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا، راون ساری دنیا کا مہاراجہ تھا ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انہیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے راون چکرورتی راجہ تھا۔ بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے، آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا، غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ کوئی اُسے ایک چلو پانی دینے والا نہ بچا۔ انسان اور جو چاہے جو برائی کرے، "غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہوگا اسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں دھکیل دیا، شاہ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا بھیک مانگ، مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے تمہارا سر پھر گیا، تب تو تم آگے پڑھ چکے، یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے۔ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی۔ مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے بار بار نہیں لگ سکتی کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی۔۔۔۔ اندھے چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے میرے

فیل ہونے پر مت جاؤ۔ میرے درجہ میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آجائے گا۔ جب الجبرا اور جیومیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب، منہ بھی تو ملے گا صفر بھی! کس خیال میں ہو، درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم کوڑیوں چارلس دماغ چکر کھانے لگتا ہے ان کمبختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے، ایک ہی نام کے پیچھے دوم سوم چہارم پنجم لگاتے چلے گئے اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ اب ج اور اج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کیلئے طالبعلموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کونسا فرق ہے مگر ممتحنوں کو کیا پرواہ وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے چاہتے ہیں سب لڑکے رٹو ہو جائیں اس رٹنت کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا؟ اس خط پر وہ عموماً اگر ا د ہ تو قاعدے عمود سے دوگنا ہوگا پوچھئے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائیگا۔ آٹھ گناہ ہو جائے میری بلا سے لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھتے بیٹھے ہیں، کہدیا "وقت کی پابندی" پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو۔ اب کاپی لئے ہوئے اس کے نام کو رو بیٹھے کون نہیں جانتا وقت کی پابندی اچھی بات ہے لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھتے؟ جو بات ایک جملہ میں کہی جا سکے اس کیلئے چار صفحے لکھنے کی کیا ضرورت، میں تو اسے حماقت کہتا ہوں مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے چاہے جیسے لکھئے اور صفحے بھی پورے فلسکیپ سائز کے یہ لڑکوں پر ستم نا روا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ظالم اس پر بھی یہ کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو تیز بھی دوڑیئے اور آہستہ آہستہ بھی یہ متضاد ہے یا نہیں، بچہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں اس پر دعویٰ ہے کہ ہم مدبر ہیں، میرے درجے میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور درجہ میں اول آگئے ہو تو اتنا اتراتے ہو، میرا کہنا مانئے، لاکھ فیل ہو گیا، لیکن تم سے بڑا ہوں،

دُنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے میرا کہنا مانو جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو، ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا، ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی، مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے، تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑ دینگے۔ انہوں نے اپنے درجے کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی اس نے مجھے بیچ بیچ لرزا دیا کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا یہی تعجب ہے، لیکن یہ سب درگت ہونیپر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور قائم رہی، کھیل کود کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا، مگر بہت کم، بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی

(۳)

پھر سالانہ امتحان ہوا، اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور میرے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے میں نے محنت زیادہ نہیں کی، مگر خدا جانے کیسے درجہ میں اول آگیا مجھے خود تعجب ہوا بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی، دس بجے رات تک اور چار بجے صبح سے، پھر اُدھر چھ سے ساڑھے نو تک، اسکول جانے کے قبل چہرہ زرد ہو گیا تھا، مگر فیل، مجھے اُن پر رحم آتا تھا، نتیجہ سنایا گیا، تو رو پڑے میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب صرف ایک درجہ کا تفاوت رہ گیا۔ میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں، پھر کس بنا پر میری فضیحت کر سکیں گے۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کیلئے۔ مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے، ضرور مگر شاید ان کی تنبیہہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنادن پاس ہو جا

جاؤں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے، کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پاکر بھی اُنہوں نے تحمل سے کام لیا، شاید اب اُنہیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب اُنہیں نہیں رہا یا رہا تو بہت کم، میری بد معاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی، میں اُنکے تحمل کا ناجائز فائدہ اُٹھانے لگا مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا پڑھوں یا نہ پڑھوں، میری تقدیر اچھی ہے اِس لئے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑی بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اُڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اِسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا۔ اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اُڑاتا تھا، ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں۔ میں انہیں یہ گمان کرنے کا موقعہ نہ دینا چاہتا تھا۔ کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

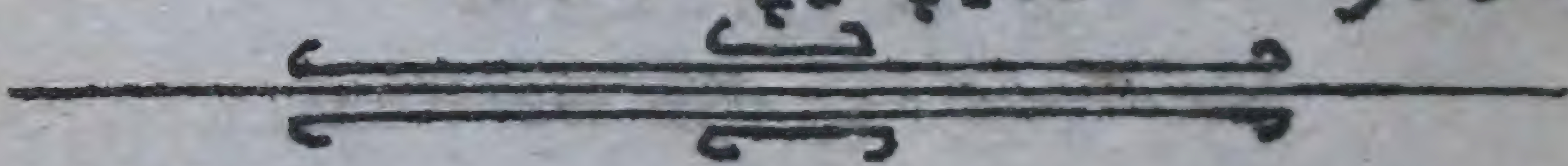
ایک روز شام کے وقت ہوسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مُڈھ بھیڑ ہو گئی شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے اُنہوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے، ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لئے دوڑتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی، تمہیں اِس کا کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو، بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو اور مجھ سے صرف ایک درجہ نیچے ہو آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے، ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو جاتے تھے، میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اول درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں، بی۔ اے اور ایم اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیروں میں اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آکر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے

کے سلئے دوڑ رہے ہو۔ افسوس ہے تمہاری اس ناعقلی پر، تم ذہین ہو، اسمیں شک نہیں لیکن وہ محض کس کام جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے، تم اپنے دل میں سمجھنے ہو گے میں محض ان سے ایک درجہ پیچھے ہوں، اور اب انہیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمہارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور رہا ہے آج تم میری جماعت میں آجاؤ اور ممتحنوں کا یہی حال رہے تو یقیناً اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ۔ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اُسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ بڑا رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر کبھی نہیں آسکو گے، چاہے تم ایم اے اور ایل ایل بی ہی کیوں نہ ہو جاؤ عقل کتابیں پڑھ لینے سے ہی نہیں آتی ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا۔ محض اس لئے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے امریکہ میں کس طرح حکومت کی ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں، اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں یہ باتیں اُنہیں نہ معلوم ہوں لیکن ہزاروں ایسی باتیں ہیں جن کا علم انہیں ہم سے زیادہ ہے آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمہارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے، سوائے دادا کو تار دینے کے تمہیں اور کچھ نہ سوجھے گا۔ لیکن تمہاری جگہ دادا ہوں گے تو کبھی کو تار نہ دیں گے بلکہ خود مرض پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے۔ اور اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے، گھبرائیں گے نہیں، بدحواس نہ ہوں گے، ہمارے خرچ کے لئے دم جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے

ہیں۔ ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں لیکن جتنا آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور اپنے کنبہ کی پرورش کی ہے۔ جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم قریب آ گئے ہو، اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کرنے پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمہیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔ میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہو کر پاچشم نم کہا ہرگز نہیں۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا اور بولے کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا میرا جی بھی کبھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے کروں گا خود بے راہ چلونگا تو تمہیں ہدایت کیسے کروں یہ تو فرض میرے سر پر ہے۔

اتفاق سے اسوقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا اس کی ڈور لٹک رہی تھی بھائی صاحب لمبے تھے اچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی اور لے کے ہوئے ہوسٹل کیطرف دوڑے میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔



مس پدما

(۱)

پدمؔا کار سے اُتر کر اپنی بہن سے گلے ملی، تو اسے خوشی کے بجائے روحانی صدمہ ہوا۔ یہ وہ رتنا نہ تھی جسے اس نے سال بھر پہلے جیجاجی کے ساتھ خوش خوش گھر آتے دیکھا تھا، شگفتہ اور مخمور اور متبسّم وہ پھول مرجھا گیا تھا۔ بہن کے خطوں سے پدمؔا کو اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے اور اس کی زندگی تلخ ہو گئی لیکن اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے اس کا اُسے گمان نہ تھا جیسے تصویر مٹ گئی ہو صرف اس کا خاکہ باقی ہو۔

اُس نے پوچھا، یہ تمہاری کیا حالت ہے بہن! کیا تم بیمار ہو؟ اپنی بیماری کی اطلاع تم نے کبھی نہ دی، رتنا حسرت ناک تبسّم کے ساتھ بولی کیا کرتی لکھ کر تقدیر میں جو تھا وہ ہوا اور آئندہ ہو گا۔ تمہیں اور اماں کو اپنی داستانِ غم سنا کر خواہ مخواہ کیوں رنجیدہ کرتی؟ تجھ سے ملنے کو دل بہت بیقرار تھا اور تو اتنی شیطان ہے کہ بار بار آنے کا وعدہ کر کے ٹال جاتی تھی ایسا غصہ آتا تھا کہ تجھے پا جاؤں تو خوب پیٹوں، مہینوں کا غبار جمع ہے چل کر ہاتھ دھو لے کچھ کھا پی کر مضبوط ہو جا۔

مگر پدما کو مطلق بھوک نہیں ہے دوپہر کو اس نے صرف ایک پیالہ اور ٹوسٹ کھایا تھا سہ پہر کو ایک سنترا، اور اب شام ہو گئی ہے گاڑی سے اُتری تو اُسکا جی کچھ کھانے کو چاہتا تھا لیکن اب جیسے بھوک غائب ہو گئی ہے اب تو رتنا سے اُسکے دل کی باتیں سننے کی بھوک جاگ گئی ہے اس نے کرسی پر بیٹھ کر کہا ججا جی تو تم سے بہت محبت کرتے تھے یکایک کیوں برہم ہو گئے۔

رتنا نے بے نور آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں شاید میں اتنی حسین نہیں ہوں یا اتنا سلیقہ در نہیں ہوں یا اتنی غلام نہیں ہوں کیونکہ اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ عورتوں کا دم بھرنے والے مرد بھی نامردوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی فراخدلی کے معاوضہ میں اور بھی کامل، بے زبان اطاعت چاہتے ہیں۔

پدما نے حقیقت کو اور واضح کرنے کے ارادہ سے پوچھا، لیکن تم ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔

رتنا تھکی ہوئی سی بولی۔ "یہی تو رونا ہے ہماری شادی بزرگوں کی طے کردہ نہ تھی ہم ایک دوسرے کے مزاج اور عادات سے اور خیالات سے خوب واقف تھے، برسوں ہمسائے رہے، ایکدوسرے کے عیب و ہنر خوب پہچاننے کے جتنے موقع ہمیں تھے بہت کم کسی کو ملتے ہوں گے ہم نے گھڑے کو خوب ٹھونک بجا کر اپنا اطمینان کر لیا تھا، ظرف میں کہیں شگاف یا درار تو نہیں، آواز اس کی سچی تھی، ٹھوس، دھات کی آواز کیطرح خوش ترنم۔ لیکن ظرف میں پانی پڑتے ہی نہ جانے کدھر سے بال نکل آئے اور سارا پانی بہہ گیا۔ اور اب گھڑا اپنی تقدیر کیطرح خشک پڑا ہوا ہے، مجھے اب معلوم ہوا کہ عورت کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شادی کو لعنت کا طوق سمجھے اور مطلق العنان رہ کر زندگی بسر کرے عورت کیلئے ہی کیوں، مرد کیلئے بھی میں شادی کو اتنا ہی مہلک سمجھتی ہوں اگر شیامو کی طبیعت مجھ سے سیر ہو گئی تو میری طبیعت بھی اُن سے کچھ کم سیر نہیں ہوئی ان

کی جن اداؤں اور خوش فعلیوں پر فدا تھی اب اُن سے مجھے نفرت ہے کیوں دل لگی یہ. حالت ہے کہہ نہیں سکتی لیکن اب میں ان کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی وہ ہنستے ہیں تو مجھے ان کی ہنسی میں چھچھورے پن کی بُو آتی ہے باتیں کرتے ہیں تو ان میں بناوٹ کا رنگ جھلکتا ہے اچکن اور پاجامہ پہنتے ہیں تو میراثیوں سے جیسے لگتے ہیں کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو جیسے کوئی کرسٹان ہو، اُن کے ساتھ جتنی دیر رہتی ہوں دل پر بہت جبر کر کے رہتی ہوں لیکن ہم دونوں میں فرق ہے. کہ وہ اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں، میں اُنکی مرضی کی غلام ہوں، اُن کیلئے میرے جیسی اور مجھ سے بدرجہا حسین دل بستگی کے لئے موجود ہیں. کوشاں ہیں طالب ہیں، میرے پاؤں میں زنجیر ہے قانون کی بھی احساسات کی بھی اور وقار کی بھی، وہ آزاد ہیں، اس لئے خوش ہیں، متحمل ہیں، ظاہر دار ہیں. میں مقید ہوں. میرا ایک ایک ذرہ ایک ایک نقطہ نفی ہے. ستم یہ ہے. کہ میں ظاہر داری کبھی نہیں کر سکتی. میں خلوص چاہتی ہوں خلوص کا غصہ میں برداشت کر سکتی ہوں. تصنع کی دلجوئی بھی برداشت نہیں کر سکتی اور جب خلوص پاتی نہیں تو خلوص دوں کہاں سے، تجھے میں یہی صلاح دوں گی کہ کبھی یہ بیڑی اپنے پاؤں میں نہ ڈالنا عورتوں نے شادی کو ذریعہ معاش سمجھ لیا ہے، میں نے بھی وہ غلطی کی اپنے کو کسی پیشے کے لئے تیار نہ کیا. لیکن تیرے لئے ابھی بہت وسیع موقع ہے تو ذہین ہے خود تجھ میں ذی حوصلہ ہے تو اگر وکالت کرے تو مجھے یقین ہے تھوڑے ہی دنوں میں تیرا رنگ جم جائے گا مرد حسن پرست ہوتے ہیں حسن اُن کے دل کی اصلی بھوک ہے کیوں نہ ہم اس کی حماقت سے فائدہ اٹھائیں. جس مقدمہ میں مرد وکیل ناکامیاب ہو جائے اس میں تو تم کے ساتھ وہ پا سکتی ہے. یہ پیارا چاند سا مکھڑا کس مرد کی نظر میں نہ کھب جائے گا لیکن وہی شخص جو ابھی تیرے قدموں پر سر رکھے اور تیری اداؤں پر قربان ہو گا، تجھ سے شادی ہو جانے پر ستم غرور کرے گا تجھ پر رعب جتائے گا.

بیوقوف رتنا لینا سب کچھ چاہتی تھی، دُنیا میں کچھ نہیں، محض اپنی انسانیت کے ہوتے پر اپنے حسن اور انداز کے بل پر، دہ عسین ہے، خوش ادا ہے، نازک اندام ہے اسلئے خلوص پانے کا حق ہے، وفا کا حق ہے، تسلیم کا حق ہے، کوٹھیاں دیگر جواہر پارے لینا چاہتی ہے۔

مسٹر شیام ناتھ جھلا آتے ہوئے نظر آئے یا پانے کمرے سے نکل کر ان سے ہاتھ ملایا۔

(۲)

پدما خود انہیں خیالات کی لڑکی تھی، اور بہن کی تاکید نے اسکے خیالات اور بھی مستحکم کردیا۔ بی۔ اے میں تو تھی ہی، امتحان میں اس نے اوّل درجہ حاصل کیا۔ قانون کا دروازہ کھلا ہوا تھا، دو سال میں اُس نے قانون بھی اول درجہ میں پاس کرلیا اور وکالت شروع کردی، اس کی ذہانت اور ذکاوت نے اس کے حسن کیساتھ ملکر سال بھر تک اُسے جونیئر وکیلوں کی صف اوّل میں بٹھادیا۔ جس اجلاس میں پہنچ جاتی ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ نوجوان وکلا چاروں طرف سے آ کر بیٹھ جاتے لوسائلانہ نظروں سے اُسے دیکھتے عدالت بھی اُن کی رعنائیوں اور شیریں بیانوں سے بے نیاز نہ رہ سکتی زہد طبیعت ججوں کی نظر بھی مسرور ہو جاتیں، چہروں پر رونق آجاتی، سبھی اُس کے ایک نظر کے متمنی تھے۔ اور اس کی وکالت کیوں نہ کامیاب ہوتی، وہ شکستوں سے ناآشنا تھی ان میں بھی فتح کا پہلو چھپا ہوا تھا۔ اس کے موکل ملزم کو الزام ہو جانیپر بھی بہت نرم سزا ملتی یا اس کا مقدمہ کمزور ہونے پر بھی فریق مخالف کا شدید ترین مواخذہ ہوتا۔ اس کیخلاف ڈگریاں بھی ہوتیں، تو اس سے عدالت کا خرچہ نہ لیا جاتا، شرح سود میں معقول ڈگریاں میں فریق ثانی کی شامت ہی آجاتی۔ اس کے حسن کا جادو نامعلوم طور پر اپنا اثر ڈالتا رہتا تھا۔

لیکن اسکی دھاگ بھی اس استغاثہ کی پیروی میں جو اس کی بہن رتنا نے مسٹر جھلا پر علیحدگی کیلئے دائر کیا میاں بیوی کے تعلقات اس درجہ کشیدہ ہو گئے تھے کہ رتنا کو اب قانون کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس کا مقدمہ ہر ایک پہلو سے کمزور تھا علیحدگی کیلئے جن قانونی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے

ان کا یہاں تعلق نہ تھا، لیکن پدما نے کچھ ایسی دقت نظری سے کام لیا کہ مقدمہ کچھ سے کچھ ہو گیا جس وقت پدما اجلاس میں آ کر کھڑی ہوتی اور اپنے موثر لہجہ میں خطیب کامل کی روانی اور انہماک اور استدلال کی وضاحت اور جامعیت کیساتھ اپنی تقریر شروع کرتی تو سامعین چشم حیرت سے دیکھتے رہ جاتے اور آپس میں کہتے یہ قدرت کی دین ہے بلاشک اس کی بحث میں استدلال کے مقابلہ میں جذبات کا پہلو غالب ہوتا لیکن اس میں نفسیات کی جگہ صداقت اور خلوص کا اتنا گہرا رنگ ہوتا کہ عدالت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ رتنا کی ڈگری ہوئی اور پدما کیلئے عروج کے دروازے کھل گئے۔

(۳)

دونوں بہنیں اب ایکساتھ رہنے لگیں۔ اس شہر میں یہ خاندان ممتاز تھا۔ پدما کے والد پنڈت امرناتھ کامیاب بیرسٹر تھے۔ اور اگرچہ انکی زندگی نے وفا نہ کی اور عین عالم شباب میں دو یتیم لڑکیاں چھوڑ کر رحلت فرما گئے۔ لیکن اتنا اثاثہ چھوڑ گئے کہ بیوہ ماں کو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ امرناتھ خود شوقین، آزاد مشرب، رنگین مزاج آدمی تھے لیکن ان کی متاہل زندگی پُرسکون تھی، باہر وہ کچھ کریں گے گھر کے اندر انکی بیوی کا راج تھا، اور وہ خوش تھی، بدمزگیاں ہوتیں لیکن سوال جواب تک رہ جاتیں، سخت زبانیوں کی نوبت نہ آئی، کول صاحبہ جاناسپر اخلاق کے اصول سے واقف تھے، انہیں یقین تھا وہ کتنی ہی بے اعتدالیاں کریں بیوی کی وفا خلوص اور اعتماد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور آج انکو مرے بیس سال ہو گئے۔ مگر وہ دیوی ابھی تک ان کی پرستش کرتی جاتی تھی، وہ صرف ایکبار کھانا کھاتی اور وہ بھی بلا نمک، زمین پر سوتی اور مہینے کے آدھے دن برت رکھتی، جیسے کوئی سنیاسی ہو۔ دونوں لڑکیوں کی اس پرورش پر اسے روحانی کوفت ہوتی تھی، مگر انہیں سمجھانے کی اس کے پاس عقل نہ تھی، نہ ہمت وہ دونوں اپنی ماں کا مضحکہ اڑاتیں اور اسے سادہ لوح، بے زبان، فرسودہ خیال سمجھ کر اس پر رحم کرتی تھیں، انہیں سے کسی کو ایسا نفس پرور، بے وفا، سرد مہر شوہر ملا ہوتا تو اسے ٹھوکر ماردیتیں اور اسکی صورت نہ دیکھتیں یا وہ اسے دکھا دیتیں کہ اگر تم کھلواڑ کر سکتے ہو تو ہم بھی تم سے کم نہیں نہ جانے اماں کیونکر ایسے وحشی

بے درد، ناشناس آدمی کیساتھ رہ سکتی تھیں اور اب بھی اس کا احترام کرتی ہیں، تعلیم نہ پانے کی ہی برکت ہے" وہی طوفان نوح کے زمانے کے خیالات ہیں، دنیا کتنی آگے نکل گئی ہے"، اُس غریب کو کیا خبر
پدما نے وکالت شروع کرتے ہی علیحدہ مکان لے لیا تھا، اماں کیساتھ اسے بہت سی قیدوں کی پابندی شرما حضوری اُسکے پاس خاطر سے کرنا پڑتی اور وہ آزاد رہنا چاہتی تھی، وہ کسی کے روبرو جوابدہ کیوں ہو؟ وہ اپنے نیک و بد کی مختار ہے، کسی کو اسکے معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، یہ وہ اسی پرانے مکان میں رہتی تھی تنہا مرحوم باپ کی پرستش کرتی ہوئی، رتنا شوہر سے علیحدہ ہو کر پدما کے ساتھ رہنے لگی۔ لیکن چند ہی مہینوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس کیساتھ نباہ نہیں ہو سکتا .... پدما نے خود ہی کوشش کر کے مفصل کے ایک شہر میں ایک مدرسہ میں جگہ دلوادی، پدما نے تعلیم سے جو فیض اُٹھایا تھا اسمیں نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھا، نیکی، روح کی پاکیزگی کیلئے زہر تھی، فرائڈ اس کا معبود تھا اور فرائڈ کے نظریئے اس کی زندگی کیلئے مشعل ہدایت، کسی عضو کو باندھ دو تھوڑے ہی دنوں میں دوران خون بند ہو جانے کے باعث بیکار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرض خطرہ میں ڈال دیگا، یہ جو جنون اور مراق اور اختلال دماغ کی اتنی کثرت ہے محض اس لئے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈال دیا، نفسیات کی یہ نئی تحقیق پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھی۔

وہ آزادی سے اپنی پرسنالٹی کی تکمیل کر رہی تھی، پیشہ کی ابتدائی کشمکش ختم ہو جانے کے بعد اب اُسکی وکالت اسطرح تھی، جیسے مچھلی کیلئے پانی، بیشتر مقدمات اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتے تھے، صرف جزئیات میں کچھ امتیاز ہوتا تھا اُن کی پیروی کے لئے کسی قسم کی تیاری یا تحقیق کی ضرورت نہ تھی محض ضابطے کی تکمیل کر دینا وہ اجلاس میں .... جا کھڑی ہوتی اور وہی ہزار بار کی دہرائی ہوئی دلیلیں اور سمجھے ہوئے الفاظ اس لئے اب اسے فرصت بھی کافی تھی، اسکے ہوا خواہوں میں کئی نوجوان رئیس تھے جو محض اس کے دیدار سے محظوظ ہونے کیلئے نئے نئے مقدمات لاتے رہتے تھے اور وکالت کے مسند کی وہ دیوی تھی

اور کتنے ہی نوجوان وکیل اس کی چوکھٹ پر جبہ سائی رہتے تھے نوجوان ہی کیوں، جہاں دیدہ بھی آپکے ہوئے بال اور پکی ہوئی عقل والے جس پر اسکی نظر کرم ہو جاتی وہ پارس ہو جاتا۔

مگر انسان کوشش کرنے پر بھی بالکل حیوان نہیں ہو سکتا۔ پدما شباب کی پہلی امنگ میں تو دلوں سے کھیلتی رہی، ناز وادا، رعنائی و دلربائی کے کرشمے اور دل افگنی کی گھاس کھر رفتہ رفتہ اسے ترمستیوں سے نفرت ہونے لگی۔ اور دل ایک وجود کی تلاش کرنے لگا جسمیں درد ہو، وفا ہو، گہرائی ہو، جس پر وہ تکیہ کر سکے۔ ان شہدوں میں بھی جو بھنورے تھے پھول کا رس لیکر اڑ جانیوالے، جو اسکے رسوخ و اثر اور کرم کیلئے اس کے عاشق بنے ہوئے تھے وہ اب ایسا چاہنے والا چاہتی تھی جو اس کے لئے زندگی قربان کر سکے، جو اسکی محبت کو اپنی زندگی کی آرزو بنالے اور جس پر وہ خود اپنے کو مٹا سکے۔

اتفاق سے ایکدن مسٹر جھبلا نظر آ گئے، اس نے اپنی کار روک لی اور بولی آپ تشریف لائیے، رشتہ ٹوٹ جانے پر کچھ اخلاقی تو نہ کی جا سکتی تھی۔

جھبلا نے اشتیاق سے کہا آج ہی آیا تھا۔ اور تم سے ملنا چاہتا تھا جب سے تمہاری وہ بحث سنی ہے اور تمہارا وہ انداز دیکھا ہے تمہارا مداح ہو گیا ہوں کسی وقت تمہیں فرصت ہو تو آؤں۔

پدما گوان سے ہمدردی ہوئی وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میں نے اپنی بہن کی حمایت میں تمہارے خلاف بہت سی غلط بیانیاں کیں، غلط الزامات لگائے لیکن وہ پیشہ کی بات تھی انہیں مجھے تم سے مطلق ملال نہیں ہے، بولی شوق سے آیئے میرے ساتھ ہی چلئے، میں گھر جا رہی ہوں۔

جھبلا آکر بیٹھ گئے اور اس مختصر سی ملاقات میں پدما کو معلوم ہوا کہ جھبلا روشن خیال اور صاف گو آدمی ہیں۔

دونوں چائے پر بیٹھے تو جھبلا نے شکایت آمیز تبسم کے ساتھ کہا آپ نے تو بحث کے دوران میں مجھے پورا شیطان بنا کر کھڑا کر دیا۔

پدما ہنس کر بولی۔ اِس کا ذکر نہ کیجئے وہ پروفیشنل معاملہ تھا۔

"تو کیا میں یہ باور کر لوں کہ آپ فی الواقع مجھے آشنا کر وہ اِنسان نہیں سمجھتیں"

"آپ کے برعکس میں آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی، مجھے تعجب ہے کہ آپ کی رتنا سے کیوں نہ پٹی"

"اگر آپ انسان کو انسان نہ سمجھ کر فرشتہ دیکھنا چاہیں تو یقیناً مایوسی ہوگی"

"شادی کر کے خوش رہنے کیلئے جس بے حسی کی ضرورت ہے آتی شاید رتنا میں نہ تھی"

"اب مجھے یہی تجربہ کرنا ہے آزاد رہ کر خوشی مِل سکتی ہے یا نہیں، شادی کر کے دیکھ لیا"

"میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے"

"انسانی ہمدردی کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں"

پدما نے عشوہ طراز نظروں سے دیکھا۔

"ایسے بے وفاؤں کی زبانی ہمدردی کے سوا اور کیا مِل سکتا ہے"

"یہ نہ بھول جائیے کہ یہ عدالت نہیں ہے"

"صفائی کا بار آپ کے اوپر ہے"

"مجھے موقع عطا کیجئے"

دوسرے دِن جھلّا پھر آئے اور زیادہ دیر تک رہے اور اس کے بعد روزانہ کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے، پدما روز بروز اُن کی طرف ملتفت ہوتی جاتی تھی ان میں وہ ساری اوصاف نظر آتے تھے جن کی اُسے بھوک تھی، ان میں خیالات کی مناسبت تھی نیک نیتی تھی ایثار تھا جذبات تھے اور کوئی ذاتی غرض نہیں تھی۔ ایکدن جھلّا نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ یہیں آ کر پریکٹس کروں مجھے اب محسوس ہو رہا ہے کہ مَیں تم سے دُور نہیں رہ سکتا۔

پدما خوش ہو کر بولی "ضرور آجائیے میری بھی یہی تمنّا ہے اور اسی مکان میں ٹھہرئیے"

"یعنی آپ کے سایہ میں بحر ممکن ؟"

"مجھ سے نفرت اور میرے سایہ سے نفرت؟"

"آپ کی آزادی میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔"

"یوں کہئے کہ آپ کو میری جانب سے اپنی آزادی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

"میں تو تائب ہو چکا۔"

"دل سے۔"

"تو مجھ سے معاہدہ کر لیجئے۔"

"دل سے"

"ہاں دل سے۔"

(۴)

رنتا نے پدما کو غصہ اور تنبیہہ سے بھرا ہوا خط لکھا، تو نے یہ کہاوت نہیں سُنی "آزمودہ را آزمودن جہل است" مجھے حیرت ہوتی ہے تو اُس شخص کے ساتھ کیوں متفق ہوئی یہ شخص دغا دے گا، یہ سکا ہے، نفسانیت سے بھرا ہوا لیکن پدما پر کوئی اثر نہ ہوا جھبلا کو وہ خط دکھا دیا۔ جھبلا بولے، تم لکھ دو "میں ان سے شادی نہیں کر رہی ہوں، اور طلاق کی نوبت نہ آئیگی۔ پدما نے شوخی کے ساتھ کہا۔ یہ تو لکھ دوں گی، میں ان سے شادی کر رہی ہوں اور کبھی طلاق نہ لوں گی۔

جھبلا کی ڈاکٹری پریکٹس برائے نام تھی، ایک کمرہ اُن کیلئے مخصوص تھا، دروازہ پر اپنا سائن بورڈ لگا دیا تھا اور صبح کو دو تین گھنٹے اپنے کمرہ میں بیٹھے ناول پڑھا کرتے تھے، جس کا انہیں بیحد شوق تھا۔ مریض عنقا تھے پدما اُن پر ایسی فریفتہ ہو گئی تھی کہ وہ جتنا چاہیں خرچ کریں اور جسطرح چاہیں خرچ کریں وہ مطلق معترض نہ ہوتی، اُن کیلئے ایک نہ ایک تحفہ روز ہی لاتی رہتی تھی۔ ایسی بیش قیمت گھڑی شہر کے بڑے سے بڑے رئیس کے پاس نہ ہوگی اُنکے لئے ایک علیحدہ کار تھی، دو سرے الگ، نوکروں کو سخت تاکید تھی کہ اُن کے کسی حکم کی تعمیل میں دیر نہ ہو، ذرا سی شکایت ہوئی اور تم گئے، روز اُن کیلئے اچھی اچھی شرابیں آتیں اور پدما کو بھی شراب کا چسکا

پڑ گیا تھا، جنت کے مزے لوٹے جا رہے تھے اور انتہا ہی نہیں، پدما جھلّا کی رضا...... کی چہیری تھی، جھلّا کا نام ہی جھلّا نہ تھا، مزاج کے بھی جھلّے تھے، ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے اور پدما ان کا مداوا کرتی اُن کا عتاب اس کیلئے ناقابلِ برداشت تھا، جھلّا کو اپنی طاقت کا علم تھا اور اس کا اظہار کرتے تھے، پدما کو اپنی کمزوری کا علم نہ تھا، وہ اسے دلجوئی سمجھتی تھی محبت میں جبر کرنے کی بے انتہا قوت ہے اور صبر کرنے کی بھی بے انتہا قوت ہے جھلّا جبر کرتے تھے، پدما صبر کرتی تھی جھلّا کا تبسم شکریہ کا ایک لفظ یا محض مسرت خاموش اسے باغ باغ کرنے کیلئے کافی تھی سیاسیات کی طرح آئینِ محبت میں حاکم ہوتا ہے، دوسرا محکوم، محکوم پسینہ نکالتا ہے، مرتا ہے سہتا ہے اور زبان نہیں کھول سکتا۔ حاکم سزائیں دیتا ہے، رعب جماتا ہے، رلاتا ہے اور ابروؤں کا شکن بھی برداشت نہیں کر سکتا، جو دیکھنے والے دیکھتے تھے اور حیرت میں آجاتے تھے یہ وہی پدما ہے، وہی غرور کی پتلی وہی نازک مزاج، فسوں طراز، مگر کتنی متحمل ہو گئی ہے اس طرح تو کوئی پٹا ہوا مرد بھی کسی حسینہ کی ناز برداری نہیں کرتا۔ کوئی بوٹی سنگھا دی ہے اسے ڈاکٹر نے، دل جلے حاسد پدما پر آوازیں کستے، پدما ہنس کر رہ جاتی، اُس کے دلدادے جو عاشق تھے اُنہیں اس کی بے زبان حلقہ بگوشی دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہتے تھے جیسے کو تیسا

ایک دن جھلّا کا ایک خط پدما نے غلطی سے کھول ڈالا جھلّا نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

"میرا خط کس نے کھولا ہے؟"

"پدما۔ شاید اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر سکی۔"

"شاید محرر کی غلطی ہو گی۔"

"میں تمہیں اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں اور تمہیں اس کا جرمانہ دینا ہو گا۔"

"حاضر ہوں سر جھکائے ہوئے۔"

جھلّا نے اُسے آغوش میں لے لیا...... اور پدما پر گھڑوں نشہ چڑھ گیا دُنیا اس کی نظروں میں حقیر تھی۔

دو سال گزر گئے۔ اور پھول مرجھانے لگا، اسمیں پھل آرہا تھا، نازک پدما لاغر ہو گئی، زرد رخسار، بے رنگ، آنکھوں میں تکان، جسم میں ڈھیلا پن، فکر مغموم اس پر ایک ہیبت سی طاری رہتی، متوحش خواب دیکھتی آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی اور آہ سرد کھینچ کر رہ جاتی، ساری دنیا کے رنگ و روغن اور بہترین مقویات اور مماث فطرت کے اس تغیر کے سامنے ہیچ تھے۔

آنکھوں کے گرد حلقے، غذا کی اشتہا غائب، مگر اسی تناسب سے پیار کی بھوک تیز، اب وہ ناز برداری چاہتی تھی کوئی اسے پان کی طرح پھیرے، اسے سینے سے لگائے، کبھی علیحدہ نہ کرے اپنے اوپر جو اعتماد تھا وہ رخصت ہو گیا۔

مگر چھلّا اس تغیر سے بے خبر اور بے اثر اپنی روش پر چلے جا رہے تھے وہی طنطنہ تھا وہی دماغ، پدما کیوں انہیں ڈنر کیلئے بلانے نہیں آئی، انہیں بھوک نہیں ہے وہ کیوں خود پان لیکر ان کے پاس نہیں آتی یہ مزاج احسن تو غائب ہو گیا وہ ادائیں ہیں نہ وہ شوخی نہ وہ ملاحت اور دماغ آسمان پر ہے، وہ چاہتے تھے، پدما ظاہر کی ان پامالیوں کو مزید التفات سے پورا کرے، ان پر قربان ہو، بلائیں لے اس طرح دونوں میں کشیدگی بڑھنے لگی پدما سوچتی کتنا بے درد آدمی ہے اور چھلّا سوچتا کتنی بے اعتنائی ہے انہیں اب اس سے گریز ہوتا تھا ان کیلئے اب یہاں دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا، جانتے تھے ہی کہ پدما ان کی لونڈی ہے پھر کیوں نہ لطف زندگی اٹھائیں، کیوں نہ رنگ رلیاں منائیں۔

پدما اپنے کمرے میں اداس بیٹھی رہتی وہ سیر کو نکل جاتے اور آدھی رات کو آتے وہ ان کا انتظار کیا کرتی۔

ایک دن اس نے شکایت کی، تم اتنی رات تک کہاں غائب رہتے ہو، تمہیں خیال بھی نہیں ہوتا، مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

چھلّا نے منہ بنایا، اچھا اب آپکو ذرا سا میرا انتظار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔

بے اعتنائی سے بولے، تو کیا چاہتی ہو، کہ میں تمہارے آنچل سے بندھا رات دن بیٹھا رہوں۔

"کچھ ہمدردی تو چاہتی ہوں۔"

"میں اپنی عادتوں کو تبدیل نہیں کر سکتا۔"

پدما خاموش ہو گئی۔ بدمزگی ہو جانیکا اندیشہ تھا۔ وہ اپنے تئیں اب اور بھی اُنکی محتاج پاتی تھی، کہیں ناراض نہ ہو جائیں کہیں چلے نہ جائیں۔ اس خیال سے ہی اسے وحشت ہوتی تھی، رتنا کا خوف تھا۔ وہ آج بھی زہریلی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے۔ کھنّا کہیں چلے گئے تو وہ کتنے طعنے دیگی۔ اسے کتنا ذلیل کریگی۔ وہ رتنا کو دکھانا چاہتی تھی تو جہاں ناکام ہوئی میں وہاں کامیاب ہوں تو نے کھنّا کو حسن سے باندھنا چاہا، ناکام ہوئی میں نے انہیں اپنی محبت سے باندھا اور باوجود کسی رسمی یا قانونی یا دھانی معاہدہ نہ ہونیکے اب تک بانہہ ہوئے ہوں وہ سب کچھ جھیل کر بھی محبت کی فتح دکھانا چاہتی اُسے اپنے سے زیادہ اس نظریئے کی فتح تھی۔

وہ درد سے بے چین تھی، لیڈی ڈاکٹر آئی، نرس آئی دایہ آئی، کھنّا کا کہیں پتہ نہ تھا بار بار جی ڈوب جاتا، کرب سے بے ہوش ہو جاتی، روتی تھی، تڑپتی تھی بدن پسینے میں تر معلوم ہوتا تھا، جان نکل جائے گی۔ کھنّا کو بار بار پوچھتی، جیسے انہی کے پاس اس درد کا علاج ہے ہاں اگر وہ آکر کھڑے ہو جاتے، اس کا سر سہلاتے، اسے پیار کرتے تو وہ اس سے بھی جانگزا درد جھیل لیتی، لیکن وہ کہاں ہیں؟ اب تک نہیں آئے اب تو بارہ بجے ہوں گے لیڈی ڈاکٹر نے کہا ساڑھے بارہ ہیں۔

"اور وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں، کوئی ذرا جا کر انہیں بلا لائے۔"

"کہاں گئے کچھ آپ کو معلوم ہے؟"

"نہیں مجھے معلوم نہیں، مگر کسی کو بھیج دو۔ تلاش کر لائے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا آپ اپنے کو اسطرح پریشان نہ کریں۔ اس سے درد بڑھتا ہے۔"

پدما چپ ہو گئی پھر تڑپنے لگی اور بے ہوش ہو گئی جب ہوش آیا تو بولی، میں اب نہ بچونگی،

مس مم یہ ضد میری جان لے کر رہے گا۔ شیام بابو آئیں تو کہہ دینا میں نے انہیں معاف کیا، مجھے
اُن سے کوئی شکایت نہیں! بچہ آپ انہیں دے دیجئے گا۔ اور میری طرف سے کہنا اسے پالو،
یہ تمہاری بدنصیب پدما کی نشانی ہے۔
اور اسے معلوم ہوا کہ جیسے تاریک نزع کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑا۔
اس کی آنکھیں کھلیں تو کہاں کہاں، کہاں! کی خوش آئیند پیاری میٹھی جاں بخش
صدا بار بار کانوں میں آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بچہ کو اس کے سامنے کر دیا جیسے اس کی آنکھوں میں
ٹھنڈک آگئی اور وہ ٹھنڈک حلق سے ہوتی ہوئی دل جگر تک پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر
بچے کو گود میں لے لیا، اور بولی شیام بابو آگئے اب ابھی تک نہیں آئے۔
اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ جیسے چراغ بجھ جائے، زندگی کی سب سے بڑی مسرت جس کے
سامنے اور سب کچھ ناچیز تھا، ناز و ادا، بناؤ سنگار، بوس و کنار، کہیں یہ لطف نہیں وہ
اس سے محروم ہو گئی وہ نوزائیدہ فرشتہ گود میں اُٹھا کر آنکھوں میں غرور اور شکر بھرے ہوئے
جذبات کیساتھ اسے جھلا کی گود میں نہ دے سکی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

(۶)

صبح ہوئی جھلا نہیں آئے شام ہوئی، رات ہوئی پھر صبح ہوئی پھر شام ہوئی یہاں تک
کہ چھ صبحیں آئیں اور گئیں جھلا نہ آئے نہ کچھ کہہ گئے نہ کوئی خط دے گئے پدما مارے فکر اور
خوف کے سوکھی جاتی تھی۔
ساتویں دن اس نے منشی جی کو بینک بھیجا، کچھ روپے نکالنے تھے منشی جی بینک سے
ناکام لوٹے، بینک کے سب روپے ڈاکٹر جھلا نکال لے گئے، پدما نے انہیں بینک سے لین
دین کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔
اس نے تعجب سے پوچھا مگر میرے بیس ہزار جمع تھے۔

"جی ہاں سب کا سب نکال لے گئے؟"

"اور کچھ معلوم ہوا کہاں گئے؟"

"جی وہاں تو کسی کو کچھ خبر نہیں۔"

پدما اسی طیش سے جھبلا کے کمرے میں گئی اور اس کی قد آدم تصویر کو جو ایکٹرارد میں بنوائی تھی اٹھا کر اتنے زور سے ٹپکا کہ شیشہ چور چور ہو گیا پھر اس تصویر کو دونوں ہاتھوں سے پھاڑا اور اسے پیروں سے خوب کچلا اور دیا سلائی لگادی پھر جھبلا کے کپڑے کتابیں صندوق، جوتے، سگریٹ کیس اور صدہا سامان جو وہاں رکھے ہوئے تھے سب کو ایک جگہ کر کے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگادی اور بلند آواز میں بولی، "شہدا، بدمعاش، حرام خور، خر دماغ، خر نفس .... ایں جھبلا! تم تم۔"

ہاں ڈاکٹر جھبلا جانے کہاں سے ٹپک پڑے تھے اور دروازے پر کھڑے یہ تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے اور دلچسپ اور غیر فانی نظروں سے۔

پدما حیرت اور خفت اور غصہ میں ڈوبی ہوئی کھڑی ہو گئی اور پوچھا، تم اب تک کہاں تھے، اور تم نے میرے لپلے کیوں اڑا لیئے شہدا بے ایمان۔

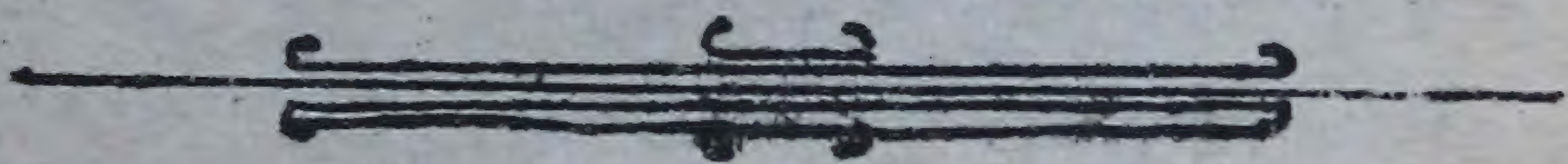
جھبلا نے ظرافت آمیز انداز سے کہا دل کا نجار اتر گیا یا باقی ہے۔

پدما جھبلا کر بولی تم نے میرے روپے چرا لیئے احسان فراموش میں تمہیں جیل کی سیر کرا کے چھوڑوں گی۔ دغا باز!

جھبلا نے نوٹوں کا ایک پلندا اُسکی طرف حقارت سے پھینکدیا اور بولے یہ لو اپنے روپے اور میرا اسلام قبول کرو یہ تھی تمہاری محبت جس کا اس شدّ و مد سے اظہار کیا جا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اپنے بلڈاگ کے ساتھ کرتی ہو اسے گود میں کھلاتی ہو۔ چومتی ہو۔ ساتھ لے کر سیر کو جاتی ہو۔ اپنی بغل میں بٹھا کر خوش ہوتی ہو۔ اُسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی ہو ڈارلنگ اور خدا جانے کیا کیا کہتی ہو، لیکن کتا ذرا دانت دکھائے تو اس پر ہنٹروں کی

بارش کر دو گی اور شاید گولی مار دو۔ میں نے تمہارا بلڈاگ تھا اتنا ہی عزیز اور اتنا ہی حقیر میں دیکھتا تھا اور امتحان لینا چاہتا تھا اور اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ میرا خیال صحیح تھا ایک ہفتہ تک غائب رہنا اتنا بڑا جرم نہ تھا نہ بیشتر اور دیئوں کی کوئی حقیقت ہے مگر تمہاری محبت دیکھ لی، رتنا مجھ سے علیحدہ ہے، مگر محض تقاضا۔ اس کا مجھ سے رُوحانی رشتہ ہے اور وہ ٹوٹ نہیں سکتا کیونکہ وہ آج بھی مسز جھلا ہے اور میں جانتا ہوں جس وقت میں نادم ہو کر اس کے سامنے جاؤں گا وہ پھر میری بیوی ہو گی اور میں اس کا غلام شوہر، تمہاری آزادی تمہیں مبارک، دیکھنا چاہتی ہو، رتنا کے خطوط، یہ لو دیکھو اور شرماؤ وہ آج بھی میرے نام پر بیٹھی ہوئی ہے، اور تم کل، ہاں کل کوئی دوسرا ڈھونڈ نکالو گی اور پھر اس پر اپنی محبتوں کی بارش کر دو گی اور بدمزاج اور غصہ ور اور سخت گیر رتنا یوں ہی مجھ سے جلتی رہے گی اور میری رہے گی۔

بلا رت کس طرح کھڑی تھی جھلا چلے جا رہے تھے جیسے قید سے چھوٹ گئے ہوں۔



ہولی کی چھٹی

ورنیکلر فائنل پاس کرنے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسہ میں جگہ مل گئی جو میرے گھر سے گیارہ میل پر تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو تعطیلوں میں لڑکوں کو پڑھانے کا خبط تھا۔ رات کو لڑکے کھانا کھا کر مدرسے آ جاتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب چارپائی پر لیٹ کر اپنے خراٹوں سے انہیں پڑھایا کرتے جب لڑکوں میں دھول دھپا شروع ہو جاتا اور شور و غل مچنے لگتا تب یکایک وہ خواب خرگوش سے چونک پڑتے۔ اور لڑکوں کو دو طمانچے لگا کر پھر خواب نوشی کے مزے لینے لگتے۔ گیارہ بارہ بجے رات تک یہی ڈراما ہوتا رہتا یہاں تک کہ لڑکے نیند سے بے قرار ہو کر وہیں ٹاٹ پر سو جاتے اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا اس لئے جنوری ہی سے ہائے توبہ مچی ہوئی تھی نائٹ مدرسوں پر اتنی رعایت تھی کہ رات کی کلاسوں میں انہیں نہ طلب کیا جاتا تھا مگر تعطیل بالکل نہ ملتی تھیں، سو نہوتی اماوس آیا اور نکل گیا، بسنت آیا اور چلا گیا شیو راتری آئی اور گذر گئی اور اتواروں کا تو ذکر ہی کیا ہے ایک دن کیلئے کون اتنا بڑا سفر کرتا اس لئے کئی مہینیں سے مجھے گھر جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ مگر اب کے میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا، چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں، میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کو الٹی میٹم دیدیا۔

کہ ۲۰ مارچ کو ہولی تعطیل شروع ہوگی اور بندہ ۱۹ مارچ کی شام کو رخصت ہو جائے گا ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہو تمہیں کیا معلوم نوکری کتنے مشکلوں سے ملتی ہے اور کتنے مشکلوں سے نبھتی ہے نوکری پانا مشکل نہیں جتنا کو اس کو نبھانا اپریل میں امتحان ہونے والا ہے۔ تین چار دن مدرسہ بند رہا تو تیاؤ کتنے لڑکے پاس ہوں گے سال بھر کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا کہ نہیں میرا کہنا مانو تو اس تعطیل میں نہ جاؤ۔

امتحان کے بعد جو تعطیل پڑے اس میں چلے جانا ایسٹر کی چار دن کی تعطیل ہوگی، میں ایک دن کیلئے بھی نہ روکوں گا۔ میں اپنے مورچہ پر قائم رہا۔ فہمائش اور تخویف اور جواب طلبی کیسی اسلحہ کا مجھ پر اثر نہ ہوا ۱۹ کو جوں ہی مدرسہ بند ہوا میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو سلام بھی کیا اور چپکے سے اپنی جائے مقام پر چلا آیا۔ انہیں سلام کرنے جاتا تو وہ ایک نہ ایک کام نکال کر مجھے روک لیتے، رجسٹر لیش فیس کی میزان لگاتے جاؤ اوسط حاضری نکالتے جاؤ لڑکوں کی مشقی کاپیاں جمع کرکے ان پر اصلاح اور تاریخ سب مکمل کر دو۔ گویا یہ میرا آخری سفر ہے اور مجھے زندگی کے سارے کام بھی ختم کر دینے چاہئیں۔

مکان پر آکر ہم نے جھٹ پٹ اپنی کتابوں کا بقچہ اٹھایا۔ اپنا ہلکا سا لحاف کندھے پر رکھا اور اسٹیشن پر چل پڑے گاڑی پانچ بجکر پانچ منٹ پر جاتی تھی، مدرسہ کی گھڑی حاضری کیوقت ہمیشہ آدھ گھنٹہ تیز اور روانگی کے وقت آدھ گھنٹہ سست رہتی تھی چار بجے مدرسہ بند ہوا تھا میرے خیال میں اسٹیشن پر پہنچنے کیلئے کافی وقت تھا پھر بھی مسافروں کو گاڑی کی طرف سے عام طور پر جو اندیشہ لگا رہتا ہے اور جو گھڑی ہاتھ میں ہونے پر بھی اور گاڑی کا صحیح وقت معلوم ہونے پر دور سے کسی گاڑی کی گڑگڑاہٹ یا سیٹی سن کر قدموں کو تیز اور دل منتشر کر دیا کرتا ہے، وہ مجھے بھی لگا ہوا تھا کتابوں کا بقچہ وزنی تھا اس پر کندھے پر لحاف، بار بار ہاتھ بدلتا تھا اور لپکا چلا جاتا تھا یہاں تک اسٹیشن کوئی دو فرلانگ سے نظر آیا۔ سگنل ڈاؤن تھا۔ میری ہمت بھی اس سگنل کیطرح پست ہو

گئی۔ تھا تو ہم سے ایک سو قدم دور، مگر یہ پاس کی ہمت تھی میرے دیکھتے دیکھتے گاڑی آئی، ایک منٹ ٹھہری اور روانہ ہو گئی۔ مدرسہ کی گھڑی یقیناً آج معمول سے بھی زیادہ سست تھی۔

اب اسٹیشن پر جانا بے سود تھا۔ دوسری گاڑی گیارہ بجے رات کو آتی تھی میرے گھر والے اسٹیشن پر کوئی بارہ بجے پہنچے گی اور وہاں سے مکان پر جاتے ہی ایک بجے جائیگا۔ اس سناٹے میں راستہ چلنا بھی ایک مہم تھی جسے سر کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی جی میں تو آیا کہ چلکر ہیڈ ماسٹر کو آڑے ہاتھوں لوں مگر ضبط کیا اور پیدل چلنے کیلئے تیار ہو گیا کل بارہ میل ہی تو ہیں اگر دو میل فی گھنٹہ بھی چلوں تو چھ گھنٹہ میں گھر پہنچ سکتا ہوں ابھی پانچ بجے ہیں ذرا قدم بڑھاتا جاؤں تو دس بجے یقیناً پہنچ جاؤں گا اماں اور منو میرا انتظار کر رہے ہوں گے پہنچتے ہی گرم گرم کھانا ملیگا گڑ لھوار میں گڑ پک رہا ہوگا۔ وہاں سے گرم گرم رس کو پینے کو آ جائے گا۔ اور جب سنیں گے میں اتنی دور سے پیدل چلا آیا ہوں تو انہیں کتنا تعجب ہوگا میں نے فوراً گنگا کیطرف قدم بڑھایا۔ یہ قصبہ ندی کے کنارے واقع تھا اور میرے گاؤں کی سڑک ندی کے اس پار سے تھی، مجھے اس راستے سے جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اتنا سنا تھا کہ کچی سڑک سیدھی چلی جاتی ہے تردد کی کوئی بات نہ تھی۔ دس منٹ میں ناؤ اس پار پہنچ جائے گی اور بس فراٹے بھرتا ہوا چل دوں گا۔ بارہ میل کہنے کو تو ہوتے ہیں، ہیں تو کل چھ کوس۔

مگر گھاٹ پر پہنچا تو ناؤ میں آدھے مسافر بھی نہ بیٹھے تھے میں کود کر جا بیٹھا کھیوے کے پیسے بھی نکال کر دیدئیے لیکن ناؤ ہے کہ وہیں قطب بنی ہوئی ہے مسافروں کی تعداد کافی نہیں ہے کیسے کھلے، لوگ تحصیل اور کچہری سے آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں اور میں ہوں کہ اندر ہی اندر کھیا جاتا ہوں سورج نیچے دوڑا چلا جا رہا ہے گویا مجھ سے بازی لگائے ہوئے ہے ابھی سفید تھا پھر زرد ہونا شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گیا دریا کے

اس پار افق پر لٹکا ہوا تھا گویا کوئی ڈول کنوئیں پر لٹک رہا ہو ہوا میں کچھ خشکی آگئی اور بھوک بھی معلوم ہونے لگی میں نے آج گھر جانے کی خوشی اور دلولے میں روٹیاں تو پکائی تھیں سوچا تھا کہ شام کو گھر پہنچ جاؤں گا لاؤ ایک پیسہ کے چنے لے کر ۔ دل ان دنوں نے اتنی دیر تک تو رفاقت کی اب پیٹ کی پیچیدگیوں میں جا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے مگر کیا غم ہے راستے میں کیا دکانیں نہ ہوں گی دو چار پیسے کی مٹھائیاں لے کر کھاؤں گا۔

جب ناؤ اس کنارے پہنچی تو سورج کی صرف آخری سانس باقی تھی حالانکہ ندی کا پاٹ بالکل بیندے میں جھپٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے بقچہ اٹھایا اور تیزی سے چلا، دونوں طرف چنے کے کھیت تھے جن کے اودے پھولوں پر شبنم کا ملکا، وہ بر جلد تا تا بے اپنا ر ایک کھیت میں گھس کر بوٹ اکھاڑ لیے اور ٹونگتا ہوا بھاگا۔

(۲)

سامنے بارہ میل کی منزل ہے کچا سنسان راستہ ۔ شام ہو گئی ہے مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ لیکن جوش طفلی نے کہا کیا مضائقہ ایک دو میل تو دوڑ ہی سکتے ہیں بارہ کو دلمیں ۱۷۶۰ سے ضرب دیا ۔ بیس ہزار گز ہی تو ہوتے ہیں بارہ میل کے مقابلہ میں بیس ہزار گز کچھ ہلکے اور آسان معلوم ہوئے اور جب دو تین میل رہ جائے گا تب تو ایک طرح سے اپنے گاؤں ہی میں ہوگا ۔ اس کا کیا شمار ، ہمت بندھ گئی اکے دکے مسافر بھی پیچھے چلے آرہے تھے اور بھی اطمینان ہوا۔

اندھیرا ہو گیا ہے میں لپکا جا رہا ہوں ، سڑک کے کنارے دور سے ایک جھونپڑی نظر آتی ہے ، ایک کپی جل رہی ہے ضرور کسی بنیے کی دکان ہو گی او رکچھ نہ ہوگا تو گڑ اور چنے تو مل ہی جائیں گے قدم اور تیز کرتا ہوں جھونپڑی آتی ہے اسکے سامنے ایک لمحہ کیلئے کھڑا ہو جاتا ہوں چار پانچ آدمی اکڑوں بیٹھے ہوئے ہیں بیچ میں ایک بوتل ہے ہر ایک کے سامنے ایک ایک

کھڑا دیوار سے ملی ہوئی اونچی گدی ہے اس پر سادھو جی بیٹھے ہوئے ہیں اُن کے سامنے کئی بوتلیں رکھی ہوئیں ہیں ذرا اور پیچھے ہٹ کر ایک آدمی کڑھائی میں سو کھے مٹر بھون رہا ہے اسکی رغبت اور سوندھی خوشبو میرے جسم میں برقی رفتار سے دوڑ جاتی ہے اضطراری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور ایک پیسہ نکال کر اسکی طرف چلتا ہوں لیکن آپ ہی قدم رک جاتے ہیں یہ کیا ہو رہا ہے......... خوانچے والا پوچھتا ہے، کیا لو گے؟

میں کہتا ہوں، کچھ نہیں۔

اور آگے بڑھ جاتا..... ہوں، دکان بھی ملی تو شراب کی۔ گویا دُنیا میں انسان کے لئے شراب ہی سب سے ضروری چیز ہے، یہ سب آدمی دھوبی اور چمار ہونگے، دوسرا کون شراب پیتا ہے۔ دیہاتیں، مگر وہ مسٹر کا دلدا دیر سوندھا پن میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اور میں بھاگا جا رہا ہوں۔

کتابوں کا بقچہ جی کا جنجال ہو رہا ہے، ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اسے یہیں سڑک پر پٹک دوں، اس کا وزن مشکل سے پانچ سیر ہوگا۔ مگر اسوقت وہ مجھے من بھر سے زیادہ معلوم ہو رہا ہے۔ جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی ہے پورنماشی کا چاند درختوں کے اوپر جا بیٹھا ہے اور پتیوں سے زمین کیطرف جھانک رہا ہے، میں بالکل اکیلا چلا جا رہا ہوں مگر خوف بالکل نہیں ہے۔ بھوک نے ساری ہیبت کو دبا رکھا ہے اور خود اُن پر حاوی ہو گئی ہے۔

آہا یہ گڑ کی خوشبو کہاں سے آئی، کہیں تازہ گڑ پک رہا ہے۔ کوئی گاؤں کے قریب ہی ہوگا وہ آموں کے جھرمٹ میں روشنی نظر آ رہی ہے، لیکن وہاں پیسے دو پیسے کا گڑ کون بیچے گا اور یوں مجھ سے مانگا نہ جائیگا۔ معلوم نہیں لوگ کیا سمجھیں آگے بڑھتا ہوں۔ مگر زبان سے رال ٹپک رہی ہے۔ گڑ سے مجھے بڑی رغبت ہے۔ جب کبھی کسی دوسری چیز کی دوکان کھولنے کی سوچتا تھا تو حلوائی کی دوکان ہوتی تھی، بکری ہو یا نہ ہو، مٹھائیاں تو کھانے کو ملیں گی۔ حلوائیوں کو دیکھو مارے مٹاپے کے ہل نہیں سکتے، لیکن یہ بیوقوف ہوتے ہیں، آرام طلبی کے باعث توند نکال لیتے ہیں، میں ورزش کرتا رہونگا۔ مگر گڑ کی، وہ ھمر آزما اور اشتہا انگیز خوشبو برابر آ رہی ہے۔ مجھے

اپنے زعم میں فرعون کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ بار بار ارادہ کرتا دن بھر میں پانچ پنڈیوں سے زیادہ نہ کھاؤں گا۔ لیکن یہ ارادہ شرابیوں کی توبہ سے زیادہ دیرپا نہ ہوتا تھا۔ گھنٹہ دو گھنٹے سے زیادہ نہ ٹکتا۔ اپنے کو کوستا۔ نفرین کرتا، گڑ تو کھا رہے ہو مگر برسات میں سارا جسم سڑ جائیگا۔ گندھک کا مرہم لگائے گھومو گے۔ کوئی تمہارے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہ کریگا۔ قسمیں کھاتا، علم کی، ماں کی، مرحوم باپ کی، گنگو کی، ایشور کی۔ مگر ان کا وہی حشر ہوتا۔ دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے ہانڈی ختم ہوگئی اس دن میں نے خشوع و خضوع کے ساتھ ایشور سے پرارتھنا کی، بھگوان یہ میرا چنچل لوبھی من مجھے پریشان کر رہا ہے۔ مجھے شکتی دو کہ میں اسکو قابو میں رکھ سکوں۔ مجھے اشٹ دھات کا لگام دو جو اسکے منہ میں ڈال دوں، یہ کمبخت مجھے اماں سے پٹوانے اور گھرکیاں سنوانے پر تلا ہوا ہے۔ تم ہی میری رکشا کرو تو بچ سکتا ہوں۔ میری آنکھوں سے اس ذوق عبودیت میں دو چار بوندیں آنسو کی بھی گریں لیکن ایشور نے بھی کچھ سماعت نہ کی اور گڑ کی خواہش مجھ پر غالب رہی۔ یہانتک کہ دوسری ہانڈی کی مرثیہ خوانی کی نوبت آ پہنچی۔ بحسن اتفاق سے انہیں دنوں تین دن کی تعطیل ہوئی اور میں اماں سے ملنے ننھیال گیا۔ اماں نے پوچھا۔ گڑ کا مٹکا دیکھا ہے چیونٹے تو نہیں لگے۔ جب تو نہیں پہنچے؟ میں نے مٹکے کو دیکھنے کی بھی قسم کھا کر اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اماں نے مجھے عزمند کی نظروں سے دیکھا، اور میری حکم پروری کے صلے میں مجھے ایک ہانڈی نکال لینے کی اجازت دے دی، ہاں تاکید بھی کر دی کہ منہ اچھی طرح بند کر دینا۔ اب تو مجھے وہاں ایک ایک دن ایک جگ معلوم ہونے لگا۔ چوتھے دن گھر آتے ہی میں نے پہلا کام جو کیا وہ مٹکے کو کھولکر ہانڈی بھر گڑ نکالنا تھا۔ یکبارگی پانچ پنڈیاں اڑا گیا۔ پھر وہی گڑ بازی شروع ہوئی۔ اب کیا غم ہے ماں کی اجازت مل گئی تھی۔ میاں بھئے کوتوال اور آٹھ دن میں ہانڈی غائب۔ آخر میں نے اپنے دل کی کمزوری سے مجبور ہو کر مٹکے کی کوٹھڑی کے دروازہ پر قفل ڈالے اور اسکی کنجی دیوار کے ایک موٹے شگاف میں ڈال دی۔ اب دیکھیں تم کیسے گڑ کھاتے ہو، اس شگاف میں سے کنجی نکال لینے کے یہ معنی تھے کہ تین ہاتھ دیوار کھود ڈالی جائے، اور یہ ہمت مجھ میں نہ تھی مگر تین دن میں ہی صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا، اور

واقعہ یاد آتا ہے، جب اماں تین ماہ کیلئے اپنے میکہ یا میری ننھیال گئی تھیں اور میں نے تین مہینے میں ایک من گڑ کا صفایا کر دیا تھا۔ یہی گڑھ کے دِن تھے، نانا بیمار تھے، اماں کو بُلا بھیجا تھا میرا امتحان قریب تھا، اسلئے میں اُنکے ساتھ نہ جا سکا تھا۔ خیر تو وہ چلی گئیں جاتے وقت اُنہوں نے ایک من گڑ لیکر ایک مٹکے میں رکھا اور اس کے مُنہ پر ایک سکورا رکھکر مٹی سے بند کر دیا۔ مجھے سخت تاکید کر دی کہ مٹکا نہ کھولنا، میرے لئے تھوڑا سا گڑ ایک ہانڈی میں رکھدیا تھا وہ ہانڈی ایک ہفتہ میں صفاچٹ کر دی۔ صبح کو دودھ کے ساتھ گڑ۔ دوپہر کو روٹیوں کے ساتھ گڑ، تیسرے پہر دانوں کے ساتھ گڑ۔ رات کو پھر دودھ کے ساتھ گڑ، یہانتک کہ جائز خرچ تھا جس پر اماں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ مگر مدرسہ سے بار بار پانی پینے کے بہانے گھر میں آتا اور دو ایک ڈلیاں نکال کر کھا لیتا۔ اس کی بجٹ میں کہاں گنجائش تھی اور مجھے گڑ کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا کہ ہر وقت وہی نشہ سوار رہتا۔ میرا گھر میں آنا گڑ کے سر شامت آنا تھا۔ ایک ہفتہ میں ہانڈی نے جواب دے دیا۔ مگر مٹکا کھولنے کی سخت ممانعت تھی اور اماں کے گھر آنے میں ابھی پورے تین مہینے باقی تھے۔ ایک دِن تو میں نے "دعا کرکے" صبر کیا، لیکن دوسرے دِن ایک آہ کے ساتھ صبر جاتا رہا۔ اور مٹکے کی ایک نگاہ شیریں کے ساتھ ہوش رخصت ہو گیا۔ میں نے کسی گناہ کبیرہ کے احساس کے ساتھ مٹکے کو کھولکر اور ہانڈی بھر گڑ نکال کر اسی طرح مٹکے کو بند کر دیا اور عہد کر لیا کہ اس ہانڈی کو تین مہینے چلاؤں گا۔ چلے یا نہ چلے مگر میں چلائے جاؤں گا۔ مٹکے کو منزل ہفت خواں سمجھوں گا جسے رستم بھی نہ کھول سکا تھا۔ میں نے مٹکے کی ڈلیوں کو کچھ اس طرح قینچی لگا کر رکھا جیسے بعض دکان دار دیا سلائی کی ڈبیاں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ایک ہانڈی گڑ خالی ہو جانے پر بھی مٹکا لبریز تھا۔ اماں کو پتہ نہ چلے گا، مواخذہ کی نوبت کیسے آئے گی۔ مگر دِل اور زبان میں وہ کشمکش شروع ہوئی کہ کیا کہوں اور ہر بار فتح زبان ہی کے ہاتھ رہتی۔ بیہودہ لگل زبان، دِل جیسے شہزور پہلوان کو پچھاڑ رہی تھی جیسے مداری بندر کو نچائے، اُسکو آسمان میں اُڑاتا ہے اور فلک الافلاک کے منصوبے باندھتا ہے اور

ان تین دنوں میں بھی دل کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے، حجرۂ شیریں کیطرف بار بار گزرتا
اور بے صبر نگاہوں سے دیکھتا اور ہاتھ مل کر رہ جاتا۔ کئی بار قفل کو کھٹکھٹایا، کھینچا، جھٹکے دیئے
مگر ظالم خود بھی نہ ہنسا۔ کئی بار اس شگاف کا جائزہ لیا اسمیں جھانک کر دیکھا۔ ایک لکڑی سے
اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر اس کی تہہ نہ ملی۔ طبیعت کھوئی ہوئی سی رہتی نہ
کھانے پینے میں کچھ مزا تھا، نہ کھیلنے کودنے میں۔ نفس بار بار منطق کے زور سے دل کو قائل
کرنے کی کوشش کرتا۔ آخر گڑ اور کس مرض کی دوا ہے۔ میں اسے پھینک تو دیتا نہیں کھاتا ہی تو ہوں
کیا آج کھایا اور کیا ایک ماہ بعد، اس میں کیا فرق ہے۔ اماں جان نے ممانعت کی ہے، بیشک
لیکن انہیں مجھے ایک جائز کام سے باز رکھنے کا کیا حق ہے۔ اگر وہ آج کہیں کھیلنے مت جاؤ، یا
درختوں پر مت چڑھو یا تالاب میں تیرنے مت جاؤ۔ یا چڑیوں کیلئے لاسا مت لگاؤ، تتلیاں مت پکڑو،
تو کیا میں مانے لیتا ہوں۔ آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں یا نہیں تو پھر اس ایک معاملہ میں کیوں اماں
کی ممانعت پر اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو قربان کر دوں۔ آخر چوتھے دن نفس نے فتح پائی
میں نے علی الصباح ایک کدال لیکر دیوار کھودنا شروع کیا۔ شگاف تھا کھودنے میں زیادہ وقت نہ
ہوئی آدھ گھنٹہ کی محنت شاقہ کے بعد دیوار سے کوئی گز لمبا اور تین انچ موٹا پتھر چھوٹ کر نیچے گر
پڑا اور شگاف کی تہہ میں وہ کلید کامیابی پڑی ہوئی تھی جیسے سمندر کی تہہ میں موتی کی سیپ
پڑی ہو میں نے جھٹ پٹ اسے نکال اور فوراً دروازہ کھولا۔ مٹکے سے گڑ نکال کر ہانڈی میں بھرا
اور دروازہ بند کر دیا۔ مٹکے میں اس دست برد سے قابل احساس کمی واقع ہو گئی تھی، ہزار ترکیبیں
آزمانے پر بھی اس کا خلا پُر نہ ہوا۔ مگر اب کی بار میں نے اس چھچھورے پن کا اماں جان کی واپسی تک
خاتمہ کر دینے کیلئے کنجی کو کنوئیں میں ڈال دیا۔ قصہ طویل ہے میں نے کیسے قفل توڑا کیسے گڑ
نکالا اور مٹکا خالی ہو جانے پر کیسے اسے پھوڑا اور اسکے ٹکڑے رات کو کنوئیں میں پھینکے اور اماں
آئیں تو میں نے کیسے رو رو کر ان سے مٹکے کے چوری جانیکی داستان کہی یہ بیان کرنے لگا تو یہ داستان جو
میں آج لکھنے بیٹھا ہوں ناتمام رہ جائے گا۔

چنانچہ اس وقت اس گڑ کی اس میٹھی اور مرغوب خوشبو نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا مگر صبر کر کے آگے بڑھا۔

جوں جوں رات گذرتی تھی جسم تکان سے چور ہوتا تھا یہاں تک کہ پاؤں میں لغزش ہونے لگی۔ کچی سڑک پر گاڑیوں کے پہیوں کی لیک پڑ گئی تھی جب کبھی لیک میں پاؤں چلا جاتا تو معلوم ہوتا کسی گہرے گڑھے میں گر پڑا ہوں بار بار جی میں آتا یہیں سڑک کے کنارے لیٹ جاؤں کتابوں کا مختصر سا بقچہ من بھر کا لگتا تھا۔ اپنے کو کوستا تھا کہ کتابیں لیکر کیوں چلا۔ دوسری زبان کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا مگر چھٹیوں میں ایکدن بھی تو کتاب کھولنے کی نوبت نہ آئے گی۔ خواہ مخواہ یہ پشتارہ اٹھائے چلا آتا ہوں۔ ایسا جی جھنجھلاتا تھا کہ اس بار حماقت کو وہیں پٹک دوں۔

آخر ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ایک بار میں گر پڑا اور سنبھل کر اٹھا تو پاؤں تھرتھرا رہے تھے۔ اب بغیر کچھ کھائے قدم اٹھانا دشوار تھا، مگر یہاں کیا کھاؤں بار بار رونے کو جی چاہتا تھا۔ اتفاق سے ایک ایکھ کا کھیت نظر آیا اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا چاہتا تھا کہ کھیت میں گھس کر چار پانچ ایکھ توڑ لوں اور مزے سے رس چوستا ہوا چلوں راستہ بھی کٹ جائیگا اور پیٹ میں کچھ پڑ بھی جائیگا مگر مینڈ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ کانٹوں میں الجھ گیا۔ کسان نے شاید مینڈ پر کانٹے بکھیر دیئے تھے، شاید بیری کی جھاڑی تھی، دھوتی کرتا سب کانٹوں میں پھنسا ہوا۔ پیچھے ہٹا تو کانٹوں کی جھاڑی ساتھ ساتھ چلی۔ کپڑے چھڑانے لگا تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگے زور سے کھینچا تو دھوتی پھٹ گئی۔ بھوک تو غائب ہو گئی فکر ہوئی اس نئی مصیبت سے کیونکر نجات ہو کانٹوں کو ایک جگہ سے الگ کرتا تو دوسرے چمٹ جاتے جھکتا تو جسم میں چبھتے، کسی کو پکاروں تو چوری کھلی جاتی ہے، عجیب مخمصے میں پڑا ہوا تھا۔ اسوقت مجھے اپنی حالت پر رونا آ گیا۔ کوئی صحرا نورد عاشق بھی اس طرح کانٹوں میں نہ پھنسا ہو گا۔ بڑی مشکل سے آدھ گھنٹہ میں گلا چھوٹا، مگر دھوتی اور کرتے کے ساتھ گئی، ہاتھ اور پاؤں چھلنی ہو گئے وہ گھاٹے میں۔ اب ایک قدم آگے رکھنا محال تھا، معلوم نہیں

راستہ طے ہوا، کتنا باقی ہے، نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد، کس سے پوچھوں، اپنی حالت پر روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک بڑا گاؤں نظر آیا بڑی خوشی ہوئی، کوئی نہ کوئی دکان مل ہی جائے گی کچھ کھاؤں گا اور کسی کے سائبان میں پڑا رہوں گا صبح دیکھی جائے گی۔

مگر دیہاتوں میں لوگ سرِ شام سونے کے عادی ہوتے ہیں، ایک آدمی کنوئیں پر پانی بھر رہا تھا، اس سے پوچھا تو اس نے نہایت ہی یاس انگیز جواب دیا۔ اب یہاں کچھ نہ ملے گا۔ بنیئے نمک تیل رکھتے ہیں حلوائی کی دکان ایک بھی نہیں۔ کوئی شہر تھوڑا ہی ہے اتنی رات تک دکان کھولے کون بیٹھا رہے

میں نے اس سے نہایت منت آمیز لہجہ میں کہا۔ کہیں سونے کو جگہ مل جائے گی۔؟

اس نے پوچھا۔ کون ہو تم ؟

تمہاری جان پہچان کا یہاں کوئی ہے ؟

جان پہچان کا کوئی ہوتا تو تم سے کیا سوال کرتا۔

تو بھئی انجان آدمی کو یہاں نہیں ٹھیرنے دیں گے، اسی طرح کل ایک مسافر آکر ٹھہرا تھا، رات کو ایک گھر میں سیندھ پڑ گئی، صبح کو مسافر کا پتہ نہ تھا۔

"تو کیا تم سمجھتے ہو، میں چور ہوں"

"کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا۔ اندر کا حال کون جانے۔"

"نہیں ٹھیرانا چاہتے نہ سہی مگر چور نہ بناؤ۔ میں جانتا یہ اتنا منحوس گاؤں ہے۔ تو ادھر آتا ہی کیوں ؟"

میں نے زیادہ خوشامد نہ کی۔ جی جل گیا۔ سڑک پر آکر پھر آگے بڑھا۔ اس وقت میرے ہوش بجا نہ تھے ..... کچھ خبر نہیں کس راستے سے گاؤں میں آیا تھا اور کدھر چلا جا رہا تھا۔ اب مجھے اپنے گھر پہنچنے کی امید نہ تھی رات یوں ہی بھٹکتے ہوئے گذرے گی پھر اس کا کیا غم کہ کہاں جا رہا ہوں معلوم نہیں کتنی دیر تک مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی، دفعتاً ایک کھیت

میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی گویا شمعِ امید ہو ضرور وہاں کوئی آدمی ہوگا۔ شاید رات کاٹنے کو جگہ مل جائے۔ قدم تیز کئے اور قریب پہنچا کہ یکایک ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا میری طرف دوڑا اتنی خوفناک آواز تھی کہ میں کانپ اٹھا ایک لمحہ میں وہ میرے سامنے آگیا اور میری طرف لپک لپک کر بھونکنے لگا میرے ہاتھوں میں کتابوں کے بقچہ کے سوا اور کیا تھا، نہ کوئی لکڑی نہ کوئی پتھر، کیسے بھگاؤں، کہیں بدمعاش میری ٹانگ پکڑ لے تو کیا کروں، تازی نسل کا شکاری کتا معلوم ہوتا تھا۔ میں جتنا ہی دھت دھت کرتا تھا اتنا ہی وہ گرجتا تھا۔ میں خاموش کھڑا ہو گیا اور بقچہ زمین پر رکھ کر پاؤں سے جوتے نکال لئے اپنی حفاظت کیلئے کوئی حربہ تو ہاتھ میں ہو، اس کیطرف غور سے دیکھ رہا تھا کہ خوفناک حد تک قریب آئے تو اسکے سر پر اتنے زور سے نعلدار جوتا ماردوں کہ یاد ہی تو کرے۔ لیکن شاید اس نے میری نیت تاڑلی اور اس طرح میری طرف جھپٹا کہ مجھے رعشہ آگیا اور جوتے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے۔ اور اسی وقت میں نے ہیبت زدہ آواز میں پکارا۔ ارے کھیت میں کوئی ہے دیکھو یہ کتا مجھے کاٹ رہا ہے، ادھر تو دیکھو۔ تمہارا کتا۔ مجھے کاٹ رہا ہے۔

جواب ملا کون ہے؟

"میں ہوں راہ گیر، تمہارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔"

"نہیں کاٹے گا نہیں، ڈرو مت کہاں جانا ہے؟"

"محمود نگر"

"محمود نگر کا راستہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے، آگے تو ندی ہے۔"

"میرا کلیجہ بیٹھ گیا، روناسا ہو کر بولا؟ محمود نگر کا راستہ کتنی دور چھوٹ گیا ہوگا۔"

"یہی کوئی تین میل۔"

اور ایک قدآور انسان ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے آکر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ سر پہ ہیٹ تھا، ایک موٹا فوجی اور کوٹ پہنے ہوئے نیچے نکر، پاؤں میں فل بوٹ، بڑا آدمی شکل بڑی مونچھیں، گورا رنگ، مردانہ وجاہت کا مجسمہ۔

بولا۔ تم تو کوئی اسکول کے لڑکے معلوم ہوتے ہو۔
"لڑکا تو نہیں ہوں، لڑکیوں کا مدرس ہوں گھر جا رہا ہوں۔ آج سے تین دن کی تعطیل ہے۔"
"تو ریل سے کیوں نہیں گئے؟"
"ریل چھوٹ گئی اور دوسری ایک بجے چھوٹتی ہے۔"
"وہ ابھی تمہیں مل جائے گی۔ بارہ کا عمل ہے۔ چلو میں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں۔"
"کون سے اسٹیشن کا۔"
"بھگونت پور کا۔"
"بھگونت پور ہی سے تو میں چلا ہوں، وہ تو بہت پیچھے چھوٹ گیا ہوگا۔"
"بالکل نہیں، تم بھگونت پور اسٹیشن سے ایک میل کے اندر کھڑے ہو۔ چلو میں تمہیں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں، ابھی گاڑی مل جائے گی۔ لیکن رہنا چاہو تو میرے جھونپڑے میں لیٹ رہو۔ کل چلے جانا۔"
اپنے اوپر غصہ آیا کہ سر پیٹ لوں۔ پانچ بجے سے تیلی کے بیل کی طرح گھوم رہا ہوں۔ اور ابھی بھگونت پور سے کل ایک میل آیا ہوں، راستہ بھول گیا۔ یہ واقعہ بھی یاد رہے گا کہ چلا چھ گھنٹے اور طے کیا ایک میل۔ گھر پہنچنے کی دھن جیسے اور بھی دہک اٹھی۔
بولا، نہیں، کل تو ہولی ہے۔ مجھے رات کو پہنچ جانا چاہیئے۔
مگر راستہ پہاڑی ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی جانور مل جائے۔ اچھا چلو میں تمہیں پہنچائے دیتا ہوں، مگر تم نے بڑی غلطی کی، انجان راستے میں رات کو پیدل چلنا کتنا خطرناک ہے۔ اچھا چلو میں پہنچائے دیتا ہوں، خیر یہیں کھڑے رہو، میں ابھی آتا ہوں۔
کتا دم ہلانے لگا۔ اور مجھ سے دوستی کرنیکا خواہشمند معلوم ہوا دم ہلاتا ہوا سر جھکائے عذر تقصیر کے طور پر میرے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ میں نے بھی فیاضی سے اسکا قصور معاف کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایک لمحہ میں وہ شخص بندوق کندھے پر رکھے آگیا اور بولا چلو مگر

اب ایسی نادانی نہ کرنا۔ خیریت ہوئی کہ میں تمہیں مل گیا۔ ندی پر پہنچ جاتے ضرور کسی جانور سے مدبھیڑ ہو جاتی۔

میں نے پوچھا۔ آپ تو کوئی انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپکا لہجہ بالکل ہمارے جیسا ہے۔

اس نے ہنسکر کہا۔ ہاں میرا باپ انگریز تھا، فوجی افسر، میری عمر یہیں گذری ہے میری ماں اُس کا کھانا پکاتی تھی۔ میں بھی فوج میں رہ چکا ہوں، یورپ کی لڑائی میں گیا تھا، اب پنشن پاتا ہوں لڑائی میں میں نے جو نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جن حالات میں مجھے زندگی بسر کرنا پڑی اور مجھے اپنے انسانی جذبات کا جس حد تک خون کرنا پڑا اُن سے اس پیشہ سے مجھے نفرت ہو گئی اور میں پنشن لے کر یہاں چلا آیا میرے پاپا نے یہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا، میں یہیں رہتا ہوں اور آس پاس کے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں یہ آنگا کی گھاٹی ہے، چاروں طرف پہاڑیاں ہیں جنگلی جانور بہت لگتے ہیں، سور، نیل گائے، ہرن ساری کھیتی برباد کر دیتے ہیں، میرا کام ہے جانوروں سے کھیتی کی حفاظت کرنا۔ کسانوں سے مجھے ہل پیچھے ایک من غلہ مل جاتا ہے وہ میرے لئے گذر بسر کیلئے کافی ہوتا ہے۔ میری بڑھیا ماں ابھی زندہ ہے جسطرح پاپا کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح اب میرا کھانا پکاتی ہے۔ کبھی کبھی میرے پاس آیا کرو، میں تمہیں کسرت کرنا سکھا دوں گا۔ سال بھر میں پہلوان ہو جاؤ گے۔ میں نے پوچھا آپ ابھی تک کسرت کرتے ہیں۔

وہ بولا۔ ہاں دو گھنٹے روزانہ کسرت کرتا ہوں۔ مگدر اور لیزم کا مجھے بہت شوق ہے میرا پچاسواں سال ہے، مگر ایک سانس میں پانچ میل دوڑ سکتا ہوں۔ کسرت نہ کروں تو اس جنگل میں رہوں گا کیسے، میں نے خوب کشتیاں لڑی ہیں، اپنی رجمنٹ میں خوب مضبوط آدمی تھا مگر اب اس فوجی زندگی کے حالات پر غور کرتا ہوں تو شرم اور افسوس سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ کتنے ہی بے گناہ میری رائفل کے شکار ہوئے، میرا انھوں نے کیا نقصان کیا تھا، میری اُن سے کونسی عداوت تھی مجھے تو جرمن اور آسٹرین سپاہی بھی ویسے ہی خلیق، ویسے ہی بہادر، ویسے ہی خوش مزاج، ویسے ہی ہمدرد معلوم ہوئے جیسے فرانس یا انگلینڈ کے، ہماری اُن سے خوب بے تکلفی ہو گئی تھی،

ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ بیٹھتے تھے، خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ لوگ ہمارا اپنے نہیں ہیں مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، کس لئے؟ اسلئے کہ بڑے بڑے انگریزوں، سوداگروں کو خطرہ تھا کہ کہیں جرمنی ان کا روزگار نہ چھین لے۔ یہ سوداگروں کا راج ہے، ہماری فوجیں انہی کے اشارہ پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہیں جان ہم غریبوں کی گئی، جیبیں گرم ہوئیں موٹے موٹے سوداگروں کی اسوقت ہماری ایسی خاطر ہوتی تھی، ایسی پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی، گویا ہم سلطنت کے داماد ہیں۔ ہمارے اوپر پھولوں کی بارش ہوتی تھی، ہمیں گارڈن پارٹیاں دی جاتی تھیں۔ ہماری جانبازیوں کی داستانیں روزانہ اخباروں میں تصویروں کے ساتھ چھپتی تھیں، نازکبدن لیڈیاں اور شہزادیاں ہمارے لئے کپڑے سیتی تھیں، طرح طرح کے مربے، اور اچار بنا بنا کر بھیجتی تھیں لیکن جب صلح ہو گئی تو انہیں جانبازوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھتا تھا، کتنوں ہی کے انگ بھنگ ہو گئے تھے کوئی لولا ہو گیا تھا کوئی لنگڑا، کوئی اندھا، انہیں ایک ٹکڑا روٹی دینے والا بھی کوئی نہ تھا، میں نے کتنوں ہی کو سڑک پر بھیک مانگتے دیکھا، تب سے مجھے اس پیشہ سے نفرت ہو گئی، میں نے یہاں آ کر یہ کام اپنے ذمہ لے لیا اور خوش ہوں سپہ گری کا یہی منشا ہے کہ اس سے غریبوں کی جان و مال کی حفاظت ہو، یہ نہیں کہ کروڑوں پیشیوں کی بے شمار دولت میں اضافہ ہو، یہاں میری جان ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے، کئی بار مرتے مرتے بچا ہوں لیکن اس کام میں مر بھی جاؤں تو مجھے افسوس نہ ہو گا کیونکہ مجھے یہ تسکین ہو گی کہ میری زندگی غریبوں کے کام آئی، اور یہ بیچارے کسان میری کتنی خاطر کرتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں، اگر میں بیمار پڑ جاؤں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ میں اُن کے تازہ خون سے اچھا ہو جاؤں گا تو وہ بے دریغ اپنا خون دیدیں گے، پہلے میں بہت شراب پیتا تھا، میری برادری کو تو تم جانتے ہو گے، ہم میں بہت زیادہ لوگ ایسے ہیں جن کو کھانا میسر ہو یا نہ ہو مگر شراب ضرور چاہیئے، میں بھی ایک بوتل شراب روز پی جاتا ہوں، باپ نے کافی پیسے چھوڑے تھے، اگر کفایت سے رہتا جاتا تو زندگی بھر آرام سے پڑا رہتا۔ مگر شراب نے ستیاناس کر دیا۔ ان دنوں میں بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ کالر، ٹائی لگائے چھیلا

بنا ہوا، نوجوان چھوکریوں سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا، گھوڑدوڑ میں جوا کھیلنا، شراب پینا کلب میں تاش کھیلنا اور عورتوں سے دِل بہلانا یہی زندگی کا مشغلہ تھا، تین چار سال ہی میں نے پچیس تیس ہزار روپے اُڑا دیئے کوڑی کفن کو نہ رکھی جب پیسے ختم ہو گئے تو روزی کی فکر ہوئی، فوج میں بھرتی ہو گیا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہاں سے کچھ سیکھ کر لوٹا۔ یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بہادر کا کام جان لینا نہیں بلکہ جان کی حفاظت کرنا ہے۔

یورپ سے آکر ایک دن میں شکار کھیلنے لگا اور اِدھر آگیا، دیکھا کئی کسان اپنے کھیتوں کے کنارے اداس کھڑے ہیں میں نے پوچھا کیا بات ہے، تم لوگ کیوں اسطرح اُداس کھڑے ہو۔

ایک آدمی نے کہا، کیا کریں زندگی سے تنگ ہیں، نہ موت آتی ہے نہ پیداوار ہوتی ہے۔ سارے جانور آکر کھیت چر جاتے ہیں، کس کے گھر سے لگان چکائیں، کیا مہاجن کو دیں، کیا عملوں کو دیں اور کیا خود کھائیں۔ کل انہیں کھیتوں کو دیکھ کر دل کا غنچہ کھل جاتا تھا آج انہیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، جانوروں نے صفایا کر دیا۔

معلوم نہیں اسوقت میرے دِل پر کس دیوتا یا نبی کا سایہ تھا کہ مجھے ان پر رحم آگیا میں نے کہا، آج سے میں تمہارے کھیتوں کی رکھوالی کروں گا، کیا مجال کہ کوئی جانور پھٹک سکے ایک دانہ جو جائے تو جرمانہ دوں۔ بس اسدن سے آج تک میرا یہی کام ہے، آج دس سال ہو گئے میں کبھی ناغہ نہیں کیا، اپنا گذر بھی ہوتا ہے اور احسان مُفت ملتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کام سے دِل کو خوشی ہوتی ہے۔

ندی آگئی، میں نے دیکھا وہی گھاٹ ہے، جہاں شام کو کشتی پر بیٹھا تھا۔ اس چاندنی میں ندی کرمع زیورات پہنے جیسے کوئی سنہرا خواب دیکھ رہی ہو۔"

میں نے پوچھا، آپ کا نام کیا ہے مگر کبھی کبھی آپ کی زیارت کو آیا کروں گا۔

اس نے لالٹین اُٹھا کر میرا چہرہ دیکھا اور بولا جیکسن ہے۔ دل جیکسن حمزدرآنا اسٹیشن کے پاس جس سے میرا نام پوچھو گے، میرا پتہ بتلا دے گا۔

یہ کہکر وہ پیچھے کیطرف مڑا، مگر یکایک لوٹ پڑا اور بولا مگر تمہیں یہاں ساری رات بیٹھنا پڑے گا اور تمہاری اماں گھبرا رہی ہوں گی، تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ تو میں تمہیں اُس پار پہنچا دوں۔ آجکل پانی بہت کم ہے، میں تو اکثر تیر آتا ہوں۔

میں نے احسان سے دبکر کہا آپ نے ہی کیا کم عنایت کی ہے کہ مجھے یہانتک پہنچا دیا ورنہ شاید گھر پہنچنا نصیب نہ ہوتا۔ میں یہاں بیٹھا رہوں گا اور صبح کو کشتی سے پار اُتر جاؤں گا۔

"واہ! اور تمہاری ماں روتی ہوں گی کہ میرے لاڈلے پر جانے کیا گذری"

یہ کہکر مسٹر جیکسن نے مجھے جھٹ اُٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا اور اس طرح بیخوف پانی میں گھسے، گویا سوکھی زمین ہے۔ میں دونوں ہاتھوں سے اُنکی گردن پکڑے ہوں اور کچھ ہنس بھی رہا ہوں پھر بھی سینہ دھڑک رہا ہے اور رگوں میں سنسنی سی دوڑ رہی ہے۔ مگر جیکسن صاحب اطمینان سے چلے جا رہے ہیں، پانی گھٹنے تک آیا، پھر کمر تک پہنچا، اوہ سینہ تک پہنچ گیا۔ اب صاحب کو ایک ایک قدم مشکل ہو رہا ہے۔ میری جان نکل رہی ہے۔ لہریں ان کے گلے لپٹ رہی ہیں، میرے پاؤں بھی چومنے لگیں۔ میرا جی چاہتا ہے ان سے کہوں، خدارا واپس چلئے مگر زبان نہیں کھلتی، ہواس نے جیسے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کیلئے سب دروازے بند کر لئے ہیں، ڈرتا ہوں کہیں جیکسن صاحب پھسلے تو اپنا کام تمام ہے، یہ تو تیراک ہیں نکل جائیں گے۔ میں لہروں کی خوراک بن جاؤنگا! فسوس آتا ہے اپنی حماقت پر، کہ تیرنا کیوں نہ سیکھ لیا جیکسن نے مجھے دونوں ہاتھوں سے کندھے کے اوپر اُٹھا لیا، ہم دھار میں پہنچ گئے تھے، بہاؤ میں اتنی تیزی تھی کہ ایک ایک قدم آگے رکھنے میں ایک ایک منٹ لگ جاتا تھا۔ دن کو اس ندی میں بارہا آ چکا تھا لیکن رات کو اور اس منجدھار میں وہ مرگ رواں معلوم ہوتی تھی، دس بارہ قدم تک میں جیکسن کے دونوں ہاتھوں پر ٹنگا رہا پھر پانی اُترنے لگا، میں دیکھ نہ سکا مگر شاید پانی جیکسن کے سر کے اوپر تک آ گیا تھا، اسی لئے اُنہوں نے مجھے ہاتھوں پر اُٹھا لیا تھا۔ جب ان کی گردن باہر نکل آئی تو زور سے ہنس کر بولے لو اب پہنچ گئے۔

میں نے کہا: "آپ کو آج میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔"

جیکسن نے مجھے ہاتھوں سے اُتار کر پھر کندھے پر بٹھلاتے ہوئے کہا اور مجھے آج جتنی مسرت ہوئی اتنی آج تک کبھی نہ ہوئی تھی جرمن کپتان کو قتل کر کے بھی۔ اپنی ماں سے کہنا مجھے دعا دیں۔

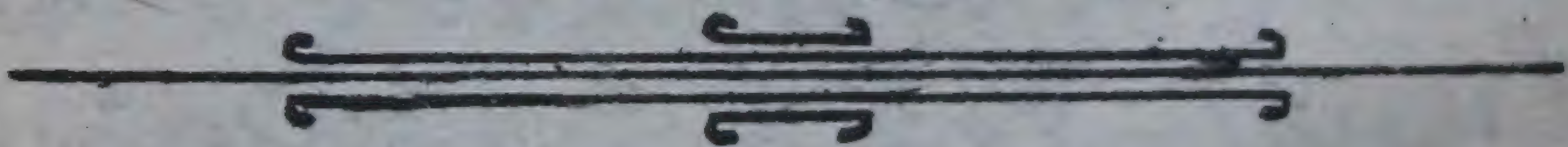
گھاٹ پر پہنچکر میں صاحب سے رخصت ہوا، شرافت، بے غرض خدمت.... اور جاں بازانہ سرفروشی کا نہ مٹنے والا نقش دل پر لئے ہوئے، میرے جی میں آیا کاش میں بھی اسی طرح لوگوں کے کام آسکتا۔

تین بجے رات کو جب میں گھر پہنچا تو ہولی میں آگ لگ رہی تھی، میں اسٹیشن سے دو میل سرپٹ دوڑتا ہوا گیا، معلوم نہیں، بھوکے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔

اماں میری آواز سنتے ہی آنگن میں نکل آئیں اور مجھے سینہ سے لگا لیا اور بولیں اتنی رات کہاں کردی۔ میں تو سانجھ سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ چلو کھانا کھالو کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں۔

وہ اب جنت میں ہیں۔ لیکن ان کا وہ محبت بھرا چہرہ میری نظروں میں ہے اور وہ پیار بھری آواز کانوں میں گونج رہی ہے؟

مسٹر جیکسن سے کئی بار مل چکا ہوں، اُسکی شرافت نے مجھے اس کا عقیدت مند بنا دیا ہے۔ میں اُسے انسان فرشتہ سمجھتا ہوں۔



زادِ راہ

سیٹھ رام ناتھ نے بستر علالت پر پڑے ہوئے مایوس نظروں سے اپنی بیوی سوشیلا کی طرف دیکھ کر کہا، میں بڑا بد قسمت ہوں، سوشیلا، میرے ساتھ تمہیں ہمیشہ تکلیف اُٹھانی پڑی. جب گھر میں کچھ نہ تھا تو شب و روز دنیاداری کے بکھیڑوں اور بچوں کے لئے مرتی رہتی تھیں جب معاملہ ذرا کچھ سنبھلا اور آرام کرنے کے دن آئے تو تمہیں چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں. آج تک مجھے زندگی کی اُمید تھی وہ اُمید جاتی رہی، دیکھو سوشیلا رووٗ مت، دنیا میں سبھی مرتے ہیں کوئی دو سال آگے، کوئی دو سال پیچھے، اب عیال داری کا بوجھ تمہارے سر پر ہے میں نے نقد روپیہ نہیں چھوڑا لیکن جو کچھ اثاثہ ہے تمہاری زندگی اس سے کسی طرح کٹ جائیگی، یہ موہن کیوں رو رہا ہے؟

سوشیلا نے آنسو پونچھ کر کہا، ضدی ہو گیا ہے، اور کیا، آج سویرے سے رٹ لگائے ہوئے ہے کہ موٹر لوں گا، پانچ روپے سے کم میں آئے گی موٹر۔

سیٹھ جی کو کچھ دنوں سے دونوں بچوں سے محبت ہو گئی تھی، بولے تو منگا دو ایک بیچارا

کو کب سے رو رہا ہے، کیا ارمان دل میں تھے سب خاک میں مل گئے رانی کیلئے ولایتی گڑیا منگوائی دوسروں کے کھلونے دیکھ کر ترستی رہتی ہے، جس دولت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھا وہ آخر کار ڈاکٹروں نے کھائی۔ بچے مجھے کیا یاد کریں گے کوئی باپ تھا، آہ بدقسمت باپ نے تو مال و زر کو لڑکے لڑکی سے پیارا سمجھا۔ ایک پیسہ کی چیز لاکر بھی نہیں دی۔ افسوس!

آخری وقت جب دنیا کی ناپائیداری حقیقت بنکر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے جو کچھ نہ کیا اس کا افسوس اور جو کچھ کیا اسکا پچھتاوا دل کو فراخ اور دردمند بنا دیتا ہے۔ بسوشیلا نے راجیہ کو بلایا اور اسے چھاتی سے لگا کر رونے لگی، وہ ماتا جو شوہر کی کنجوس طبیعت کے سبب اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتی تھی اسو قت جیسے ابل پڑی۔ لیکن موٹر کیلئے روپے کہاں تھے۔

سیٹھ جی نے پوچھا، موٹر لے لو بیٹا، اپنی اماں سے روپے لیکر بہن کیساتھ چلے جاؤ خوب عمدہ لانا۔

موہن نے ماں کے آنسو اور باپ کا پیار دیکھا تو اس کی ضد پگھل گئی، بولا۔ ابھی نہیں لوں گا۔ سیٹھ جی نے پوچھا کیوں؟

"جب آپ اچھے ہو جائیں گے تب لوں گا۔"

سیٹھ جی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

(۲)

تیسرے روز سیٹھ رام ناتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دولتمند کے زندہ رہنے سے دکھ بہتوں کو ہوتا ہے اور سکھ تھوڑوں کو، ان کے مرنے سے دکھ چند کو ہوتا ہے اور سکھ زیادہ کو، اب مہابرہمنوں کا گروہ الگ خوش ہے پنڈت جی الگ بشاش ہیں اور شاید برادری کے لوگ بھی خوش ہیں۔ اسلئے ایک برابر کا آدمی کم ہو گیا، دل سے ایک کانٹا نکل گیا۔ اور پٹی داروں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اب وہ پرانی کسر نکالیں گے، دل کو ٹھنڈا کرنے کا ایسا موقعہ بہت دنوں کے بعد ملا ہے۔

آج پانچواں دن ہے وہ عالی شان مکان سونا پڑا ہے، بچے نہ رہتے ہیں نہ ہنستے ہیں من مارے ماں کے پاس بیٹھے ہیں، گھر میں جو روپے بچ رہے تھے وہ تجہیز و تکفین کی نذر ہو گئے اللہ ابھی سارے رسوم باقی ہیں، خدا کیسے بیڑا پار لائے گا۔

کسی نے دروازہ پر آواز دی، مہرا نے آکر سیٹھ دھنی رام کے آنیکی خبر دی دونوں بچے باہر دوڑے، سوشیلا کا دل بھی ایک لمحہ کیلئے تازہ ہو گیا، سیٹھ دھنی رام برادری کے چودھری تھے بیکس بیوہ کا دل سیٹھ جی کی اس دلجوئی سے خوش ہو گیا۔ آخر برادری کے سرپنچ ہیں، لوگ بیکس بیوہ اور یتیم بچوں کی خبر نہ لیں تو اور کون لے۔ آفرین ہے ایسے نیک بندوں پر جو مصیبت کیوقت بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ سوشیلا گھونگھٹ نکال کر برآمدہ میں آکر کھڑی ہو گئی دیکھا تو علاوہ دھنی رام کے اور بھی کئی بھلے آدمی کھڑے ہیں۔

دھنی رام جی بولے۔ بہو جی! بھائی رام ناتھ کی بے وقت موت سے ہم لوگوں کو رنج ہوا ہے وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ ابھی اُنکی عمر ہی کیا تھی، لیکن پرماتما کی مرضی، اب تو ہمارا یہی فرض ہے کہ پرمیشور پر بھروسہ رکھیں اور آگے کیلئے کوئی راستہ نکالیں، کام ایسا کرنا چاہیئے کہ گھر کی عزت بنی رہے اور ہمارے مرحوم بھائی کی رُوح کو تسکین ہو۔

کبیر داس نے سوشیلا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا، عزت کے سوا دنیا میں اور ہے کیا، اس کو نبھانا، اس کی حفاظت ہمارا دھرم ہے، لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے کتنے روپے تمہارے پاس ہیں بہو!

سوشیلا۔ گھر میں روپے کہاں ہیں سیٹھ جی، جو تھوڑے بہت تھے، بیماری میں اُٹھ گئے۔

دھنی رام۔ تو یہ نئی اُلجھن پیدا ہو گئی، ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

کبیر چند۔ جو کچھ بھی دعوت تو دینی ہی ہو گی ہاں اپنا لیکھا دیکھکر کام کرنا چاہیئے۔ میں قرض لینے کی صلاح نہ دونگا۔ گھر میں جتنے روپے کا انتظام ہو سکے اُسمیں کوئی کسر نہیں رکھنی چاہیے، مرنے والے کیساتھ ہمارا ابھی تو کوئی فرض ہے، اب تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آئیگا، اس سے ہمیشہ

کیلئے رشتہ ٹوٹ رہا ہے اسلئے سب کچھ حیثیت کیمطابق ہونا چاہیئے، برہمنوں کو تو دہی مٹھائیاں دیجائیں گی لیکن برادری کی دعوت اس اعتبار سے کرنی چاہیئے کہ عزت میں فرق نہ آنے۔

دھنی رام، تو کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے تو ایک بڑی عجیب بات کہدی

بھوجی! دو چار ہزار بھی نہیں۔

سوشیلا۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے بھلا ایسے وقت جھوٹ بولوں گی۔

دھنی رام نے کبیر چند کیطرف دیکھ کر کہا۔ تب تو یہ مکان بیچنا پڑے گا۔

کبیر چند۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ناک کٹانا تو اچھا نہیں ہے رام ناتھ کا کتنا نام تھا برادری کے ستون تھے یہی اسوقت ایک علاج ہے بیس ہزار مہر نکلتے ہیں سود ڈیڑھ لگاکر کوئی پچیس ہزار ہوں گے۔ باقی رذلی میں خرچ ہو جائینگے۔ اگر کچھ بچ رہا تو بال بچوں کے کام آجائیگا

دھنی رام۔ آپ کے پاس یہ گھر کتنے میں رہن ہے۔

کبیر چند۔ بیس ہزار روپیہ سینکڑہ سود۔

دھنی رام۔ میں نے تو کم سنا ہے۔

کبیر۔ اس کا تو رہن نامہ رکھا ہے۔ زبانی بات چیت تھوڑی ہے۔ میں دو چار ہزار کیلئے جھوٹ نہ بولوں گا۔

دھنی۔ نہیں نہیں، یہ میں کب کہتا ہوں، تو تو نے سن لیا بابائی۔ پنچوں کی صلاح ہے کہ مکان بیچ دیا جائے۔

سوشیلا کا چھوٹا بھائی سنت لال بھی اسوقت آپہنچا یہ آخری الفاظ اس کے کان میں پہنچ گئے۔ وہ بول اٹھا کس لئے مکان بیچ دیا جائے برادری تنگی رذلی کیلئے۔ برادری تو کھا پی کر راستہ لے گی۔ ان یتیموں کی کون پرورش کرے گا۔ یہ بھی تو سوچنا چاہیئے۔

دھنی رام نے غصہ بھری آنکھوں سے دیکھکر کہا۔ آپکو ان معاملوں میں ٹانگ اڑانیکا کوئی حق نہیں صرف آئندہ کا فکر کرنیسے کام نہ چلیگا۔ مرحوم کلیجے پھائے کیجھی طرح سدھار نا پڑیگا۔ ہنسی تو

ہماری ہوئی دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نہیں، وقار کیلئے لوگ جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ جب وقار ہی نہ رہا تو کیا رہ گیا۔ اگر ہماری صلاح پوچھے گے تو ہم تو یہی کہینگے آگے بائی کو اختیار ہے، جیسا چاہے کرے، پر ہم سے سروکار نہ ہوگا چلئے کبیر چند جی چلیں۔

سوشیلا نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ بھیا کی باتوں کا خیال نہ کیجئے سیٹھ جی! انکی تو یہ عادت ہے میں نے تو آپکی بات نہیں ٹالی۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ گھر کا حال آپکو معلوم ہی ہے۔ میں اپنے مالک کی روح کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی لیکن جب انکے بال بچے ٹھوکریں کھائیں گے تو، تو انکی روح رنجیدہ نہ ہو گی؟ بیٹی کا بیاہ کرنا ہی ہوگا، لڑکے کو لکھانا پڑھانا پڑیگا ہی، برتنوں کو کھلا دیجئے لیکن روٹی کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔

دونوں اصحاب کو گویا تھپیڑ لگ گیا۔ بھلا ایسی بات کبھی زبان سے نکالی جاتی ہے۔ برہمن لوگ اپنے منہ پر سیاہی نہ لگنے دیں گے۔ دنیا بیوہ عورت پر نہیں ہنسے گی، ہنسی ہوگی پنچوں کی۔ یہ جگ ہنسائی وہ کیسے سہہ سکتے ہیں۔ ایسے گھر کے دروازہ پر جھانکنا بھی گناہ ہے۔

سوشیلا رو کر بولی، میں غریب ہوں، نادان ہوں مجھ پر غصہ نہ کیجئے۔ آپ لوگ ہی مجھے چھوڑ دیں گے تو میرا گذارہ کیسے ہوگا۔

اتنے میں دو اصحاب اور آگئے ایک بہت موٹے، دوسرے بہت دبلے، نام بھی اسم بامسمّی بھیم چند اور دربل داس، دھنی رام نے چند لفظوں میں ساری کیفیت انہیں سمجھا دی۔ دربل داس نے بہت ہمدردی سے کہا۔ تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہم لوگ مل کر کچھ روپے دے دیں اس کا لڑکا سیانا ہو جائے گا تو روپے مل ہی جائینگے اگر نہ بھی ملیں تو ایک دوست کیلئے کچھ بل کھا جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

بسنت لال نے خوش ہو کر کہا، اتنی مہربانی آپ لوگ کریں تو کیا کہنا۔

کبیر چند تیوری چڑھا کر بولے، تم سب سُتر بیر کی باتیں کرنے لگے۔ دربل داس جی، اسوقت بازار میں کسی کے پاس فالتو روپے رکھے ہوئے ہیں جو دیدے گا۔ زمانہ کا رنگ نہیں دیکھتے۔

بھیم چند۔ یہ تو ٹھیک ہے، ایسا مندا بازار تو کبھی دیکھا ہی نہیں، مگر نبھاؤ تو کرنا چاہیئے۔
کبیر چند اکڑ گئے، وہ سوشیلا کے مکان پر دانت لگائے ہوئے تھے، ایسی باتوں سے شکار ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا، وہ اپنے روپے وصول کر کے چھوڑیں گے، عورتوں کے جھمیلے میں پڑ کر اپنا نقصان کیوں کریں، بھیم چند نے بہت اچھا کیا، انہیں ہوشیار کر دیا۔ لیکن ضیافت تو دینی ہی پڑے گی۔ پنچ لوگ برادری کی ناک نہیں کٹوا سکتے۔
سوشیلا نے دربل داس میں ہمدردی کا شائبہ دیکھا۔ ان کی طرف بیکس نظروں سے دیکھ کر بولی۔ میں آپ لوگوں سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔ آپ لوگ مالک ہیں جیسا مناسب سمجھیں کریں۔
دربل داس نے پوچھا۔ تیرے پاس کچھ تھوڑے بہت زیور تو ہوں گے ہی۔
سوشیلا نے قبول کیا۔ ہاں تھوڑے سے گہنے پڑے ہوں گے، بیماری میں آدھے سے زیادہ بک گئے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے سارے زیور لا کر پنچوں کے سامنے رکھ دیئے۔
دھنی رام بولے۔ مگر یہ تو مشکل سے تین ہزار میں اُٹھیں گے۔
دربل داس نے پوٹلی کو ہاتھ میں تول کر کہا، تیس ہزار کیسے ہیں ساڑھے تین ہزار سے بڑھ جائیگا۔
بھیم چند نے پھر پوٹلی کو جانچ کر کہا۔ میری بولی چار ہزار کی ہے۔
کبیر چند کو مکان کے فروخت کرنے کا سوال چھیڑنے کا پھر موقع ملا۔ بولے چار ہزار میں کیا ہوا جاتا ہے، برادری کا کھلانا ہے یا کوئی بلا ٹالنا ہے۔ کم سے کم دس ہزار کا خرچ ہے، مکان تو نکالنا ہی پڑے گا۔
سنت لال نے ہونٹ چبا کر کہا۔ میں کہتا ہوں آپ لوگ کیا اتنے بے رحم ہیں۔ آپ لوگوں کو یتیم بچوں پر بھی رحم نہیں آتا۔ کیا انہیں بھکاری بنا کر چھوڑو گے۔
لیکن سنت لال کی فریاد پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ بلا مکان فروخت کئے کسی طرح کام نہیں چل سکتا بازار آجکل مندا ہے تیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے، پچیس ہزار تو کبیر داس کے ہیں یا پچھتر ابھی ہیں گے، اچھی طرح تو ہزار میں بڑی کفایت سے برہم بھوج بھی ہو جائیگا اور برادری کی

دعوت بھی ہو جائے گی۔ پنچوں کو آخر بال بچوں کا خیال بھی تو کرنا ہے۔

سوشیلا نے دونوں بچوں کو سامنے کرکے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ پنچو میرے بچوں کا منہ دیکھو! میرے گھر میں جو کچھ ہے سب لے لیجئے لیکن مکان چھوڑ دیجئے۔ مجھے ٹھکانہ نہ ملے گا، میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، مکان اسوقت نہ بیچیں۔

اس بے وقوفی کا کیا جواب دیا جائے۔ پنچ لوگ تو چاہتے تھے کہ مکان نہ بیچنا پڑے، اُنہیں یتیم بچوں سے کچھ دشمنی نہیں لیکن برادری کا کھانا اور کس طریقہ سے کیا جائے، اگر بیوہ پانچ ہزار کا انتظام اور کر دے تو مکان فی الحال بچ سکتا ہے، جب وہ ایسا نہیں کر سکتی تو مکان فروخت کرنے کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

کبیر داس نے کہا، دیکھ بائی، بازار کی حالت آج کل خراب ہے، روپیہ کہیں سے اُدھار نہیں مل سکتا، بال بچوں کے بھاگ میں لکھا ہوگا تو بھگوان اور کسی حیلے سے دیدیں گے جیسے روزی بہانہ موت، بھگوان جس کو پیدا کرتے ہیں اسکے رزق کا انتظام بھی کر دیتے ہیں، ہم تجھے سمجھا کر ہار گئے اگر تو اپنی ہٹ نہیں چھوڑے گی تو ہم بات بھی نہ کریں گے پھر یہاں تیرا رہنا مشکل ہو جائے گا شہر والے تیرے پیچھے پڑ جائیں گے۔

بیوہ سوشیلا اور کیا کرتی، پنچوں سے لڑ کر وہ کیسے رہ سکتی تھی، پانی میں رہ کر مگرمچھ سے کون دشمنی کر سکتا ہے، وہ اندر جانے کیلئے اٹھی مگر وہیں بیہوش ہو کر گر پڑی، ابھی تک کچھ اُمید قائم تھی بچوں کی پرورش میں وہ اپنی بیوگی کو بھول سکتی تھی مگر اب تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔

(۳)

میٹھے رام ناتھ کے دوستوں کا اُنکے گھر پر پورا حق تھا، دوستوں کا حق نہ ہو تو کس کا ہو عورت کون ہوتی ہے جب وہ اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھتی کہ برادری کو روٹی دینا اور دھوم دھام دینا لازمی ہے تو اس کا زیادہ سمجھانا فضول ہے، اب زیورات کون خریدے، بھیم چند چار ہزار کا

چکے تھے۔ لیکن آپ ان کو دم ہوا ان سے بھول ہوئی تھی دریں ابن کر ہاتھ ہزار لگائے تھے اسلئے سودا انہیں کے ہاتھ میں اس بات پر بھیم چند اور دربل داس میں ہو گئی لیکن بھیم چند کو منہ کی کھانی پڑی۔ انصاف دربل کیطرف تھا۔

دھنی رام نے ذرا چٹکی لی، دیکھو دربل داس مال تو لے جاتے ہو مگر ساڑھے تین ہزار سے زائد کھا گئے ہیں انصاف کا خون نہ ہونے دوں گا۔

کبیر داس بولے "اجی تو گھر میں ہی تو ہے کہیں باہر تو نہیں گیا۔ ایک دو دن دوستوں کی دعوت ہو جائیگی اس پر چار دن اصحاب ہنس پڑے، اس کام سے فرصت پاکر اس مکان کا سوال اُٹھا، کبیر داس تیس ہزار دینے پر تیار تھے، لیکن قانونی کاروائی کے بغیر معاملہ پختہ نہ تھا یہ خامی کیوں رکھی جائے، فوراً ایک دلال بُلایا گیا۔ پستہ قد آدمی، پوپلا منہ، کوئی ستر سال کی عمر، نام تھا چوکھے لال۔"

کبیر داس نے کہا، "چوکھے لال سے ہماری تیس سال کی دوستی ہے، آدمی کیا ہیرا ہے۔"

بھیم چند، دیکھو چوکھے لال یہ مکان بکتا ہے۔ اس کیلئے کوئی اچھا خریدار لاؤ، تمہاری دلالی پکی۔

کبیر داس، بازار کا حال اچھا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ رام ناتھ کے بچوں کو خسارہ نہ رہے (چوکھے لال کے کان میں) تیس سے آگے نہ بڑھنا۔

بھیم چند، دیکھئے، کبیر داس یہ اچھی بات نہیں ہے۔

کبیر داس تو میں کیا کہہ رہا ہوں، میں تو یہی کہہ رہا تھا کہ اچھے دام لگانا۔

چوکھے لال، آپ لوگوں کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں، میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں، رام ناتھ میرے بھی دوست تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مکان کے بنوانے میں ایک لاکھ سے ایک پائی بھی کم خرچ نہیں ہوئی۔ لیکن بازار کا حال کیا آپ لوگوں سے چھپا ہوا ہے، اسوقت اسکے

پچیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے۔ سبھیتے سے کوئی گاہک ملجائے تو دس پانچ ہزار اور مل جائیں گے لیکن اسوقت پچیس ہزار بھی بہت ہیں۔

دھنی رام۔ پچیس ہزار تو بہت کم ہیں بھائی اور نہ سہی تو تیس ہزار تو کرا دو۔

چوکھے لال۔ تیس کیا میں چالیس کر دوں، کوئی گاہک تو ہے۔ آپ لوگ کہتے ہیں تو میں تیس ہزار کی بات چیت کروں گا۔

دھنی رام۔ جب تیس ہزار میں دینا ہے تو کبیر داس ہی کیوں نہ لے لیں۔ اتنا سستا مال دوسروں کو کیوں دیا جائے۔

کبیر داس۔ آپ سب لوگوں کی جیسی رائے ہو میں تو یہی چاہتا ہوں کہ بائی کے ساتھ جہاں تک ہو سکے رعایت کی جائے۔

دھنی رام جی نے ہاں ہاں کہکر منظوری دیدی۔ بھیم چند من میں اینٹھ کر رہ گیا۔

یہ سودا بھی پکا ہو گیا۔ اسی دن وکیل نے بیعنامہ لکھا۔ جھٹ رجسٹری ہو گئی۔ منو شیلا کے سامنے بیعنامہ لایا گیا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اسپر دستخط کر دیئے۔ اسکے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بیوفا دولت کی طرح یہ گھر بھی سکھ کے دنوں میں اسکا ساتھی رہ کر دکھ میں ساتھ چھوڑ رہا ہے۔

پنچ لوگ منو شیلا کے صحن میں بیٹھے برادری کو رقعے لکھ رہے ہیں اور لاوارث بیوہ گھر کے اندر بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔ ادھر رقعہ تیار ہوا۔ ادھر بیکس بیوہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رقعے پر گرے۔

دھنی رام نے اوپر دیکھ کر کہا۔ پانی کی چھینٹ کہاں سے آئی۔

سنت رام۔ بائی بیٹھی رو رہی ہے۔ اس نے رقعے پر اپنے خون کے آنسوؤں کی مہر لگا دی ہے۔

دھنی رام (اونچی آواز میں) ارے تو کیوں رو رہی ہے۔ بائی یہ رونے کا وقت نہیں تجھے

تو خوش ہونا چاہیے۔ کہ پنچ لوگ تیرے گھر میں آج نیک کام کرنے کیلئے جمع ہوئے ہیں جس خاوند کے ساتھ تو نے عیش و آرام سے رہی اس کی آتما کیلئے کچھ "زادِ راہ" دے گی اس کی مکتی کیطرف تیرا ذرا بھی دھیان نہیں؟

برادری میں رقعہ پھرا، اور پھر تین چار دن پنچوں نے دعوت کی تیاری میں صرف کئے گھی دھنی رام جی کی آڑھت سے آیا، میدہ اور چینی کی آڑھت بھی انہیں کی تھی، پانچویں دن صبح کے وقت برہمنوں کو کھانا ہوا۔ شام کی برادری کی روٹی ہوئی، سوشیلا کے دروازے پر گاڑیوں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں، صحن، بیٹھک، دالان، برآمدہ اُوپر کی چھت پر سب مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ کھانا کھاتے تھے اور پنچوں کی تعریفیں کر رہے تھے۔

سیٹھ چمپارام کی روٹی کے بعد ایسی روٹی ہوئی ہے۔

"امرتیاں کیسی خستہ ہیں۔"

"رس گلے میدے سے بھرے ہیں۔"

"سارا انتظام پنچوں کا ہے۔"

دھنی رام نے انکساری سے کہا۔ رام ناتھ سے بھائی چارہ تھا، ہم نہ کرتے تو کون کرتا۔ یہ سمجھ لو کہ چار دن سے سونا نصیب نہیں ہوا۔

"آفریں دوست ہوں تو ایسے ہوں۔"

"کیا بات ہے، آپ نے رام ناتھ جی کا نام رکھ لیا، برادری ہی کھانا کھلانا دیکھتی ہے۔ قسمت کو دیکھتے نہیں آتی۔"

مہمان لوگ تعریفیں کر کے تر مال اُڑاتے تھے، اور ادھر کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی سوشیلا سوچ رہی تھی: "دنیا میں ایسے خود غرض لوگ بھی ہیں، ساری دنیا مطلب پرست بن گئی ہے، سب پیٹوں پر ہاتھ پھیر کر کھانا کھا رہے ہیں، کوئی اتنا بھی نہیں سوچتا

کہ غریب یتیموں کیلئے کچھ بچا یا یا نہیں۔"

ایک مہینہ گذر گیا۔

سوشیلا پیسے پیسے کو محتاج ہو رہی تھی۔ نقد تھا ہی نہیں، زیور نکل ہی گئے اب صرف تھوڑے سے برتن بیچ رہے تھے، اُدھر بہت سے چھوٹے چھوٹے بل چکانے تھے، کچھ روپے ڈاکٹر کو دینے تھے۔ کچھ بنئے کو، کچھ درزی کو، سوشیلا کو تمیں گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر چکانا پڑیں۔ اور مہینہ پورا ہوتے ہوتے اس کے پاس کچھ نہ بچا۔ بیچارہ سنت لال ایک دوکان میں منیم تھا، کبھی کبھی دو چار روپے دے دیتا، اور خرچ کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا، بچے تو صورت حال کو سمجھتے تھے ماں کو دق کرتے تھے۔ لیکن مکان کے سامنے سے کوئی خوانچے والا نکل جاتا اور دونوں دوسرے بچوں کو پھل یا مٹھائیاں کھاتے دیکھتے تو اُن کے منہ میں چاہے پانی نہ آئے، آنکھوں میں ضرور آجاتا تھا، ایسی للچائی نظروں سے دیکھتے کہ رحم آجاتا، وہی بچے جو چند روز پہلے میوے اور مٹھائیوں کی طرف تاکتے بھی نہ تھے اب ایک ایک پیسے کی چیز کو ترستے تھے۔ وہی حضرات جنہوں نے برادری کو دعوت کرائی تھی، مکان کے سامنے سے نکل جاتے تھے پر کوئی جھانکتا تک نہ تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ سوشیلا چولہا جلائے روٹیاں سینک رہی تھی۔ اور دونوں بچے چولہے کے پاس بیٹھے روٹیوں کو گرسنہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دال پکنے کا انتظار تھا۔ لڑکی گیارہ سال کی تھی، لڑکا آٹھ سال کا۔

موہن بے صبر ہو کر بولا، اماں مجھے روکھی روٹیاں ہی دے دو۔ بڑی بھوک لگی ہے۔

سوشیلا نے محبت آمیز لہجہ میں کہا، ذرا اور صبر کرو بیٹا، ابھی دال پکی جاتی ہے

ریوتی کو بھائی پر رحم آگیا، بولی میرے پاس ایک پیسہ ہے، میں دہی منگائے لاتی

سوشیلا نے پوچھا۔ تو نے پیسہ کہاں سے پایا؟
ریوتی نے معصومانہ انداز میں کہا۔ مجھے کل اپنی گڑیوں کی پٹاری میں ملا تھا۔
سوشیلا مطمئن ہو کر بولی، اچھا جا، مگر جلدی آئیو۔
ریوتی دوڑی ہوئی باہر گئی اور ایک پیسے پر ذرا سی دہی لے آئی۔ ماں نے روٹی دے دی۔

موہن دہی سے روٹی کھانے لگا، عام لڑکوں کی طرح وہ بھی خود غرض تھا۔ بہن سے پوچھا بھی نہیں۔
سوشیلا نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ اکیلا ہی کھا جائے گا۔ بہن کو بھی دے گا۔
موہن شرمندہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔
ریوتی بولی، نہیں اماں کتنا ملا ہے۔ تم کھا لو موہن تمہیں جلد نیند آجاتی ہے میں تو دال کے ساتھ کھاؤں گی۔

اسی وقت دو آدمیوں نے باہر سے آواز دی، ریوتی نے باہر جا کر پوچھا۔ معلوم ہوا سیٹھ گبیر داس کے آدمی ہیں مکان خالی کرانے آئے ہیں۔ سوشیلا کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔

پردے میں آ کر بولی۔ ابھی میرے شوہر کی وفات کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور ابھی سے مکان خالی کرانے کی دھن سوار ہو گئی۔ میرا پچاس ہزار کا مکان تیس ہزار میں لے لیا اس پر پانچ ہزار سود کے ہضم کئے پھر بھی پیٹ نہیں بھرا۔ کہہ دو، میں ابھی مکان خالی نہ کروں گی۔
منیم نے ملائمت سے کہا، بائی جی میں تو نوکر ہوں، میرا کیا اختیار ہے۔ جب ملکیت دوسرے کی ہو گئی تب آپ کو مجبوراً چھوڑنی ہی پڑے گی۔ قانون تو کسی کی حالت کو نہیں دیکھتا۔

سوشیلا سمجھ گئی۔ منیم کیا کہتا ہے۔ رحم اور انسانیت کے بل پر کب تک گذارہ ہوگا۔ نرم
ہو کر بولی۔ اتنا میں بھی جانتی ہوں منیم جی۔ تم سیٹھ جی سے میری طرف سے عرض کرنا
دس دن کی مہلت اور دیدیں۔ تمہیں سمجھ غرض عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں دس
ماہ کے دن کے لئے کسی کا احسان لوں۔ میری تقدیر میں اس گھر میں رہنا لکھا ہوتا
تو کیوں ہاتھ سے نکل جاتا

منیم نے پوچھا۔ تو کل سویرے تک خالی ہو جائیگا۔

سوشیلا تو بولی۔ ہاں ہاں کہتی تو ہوں۔ کہ کل سویرے تک مکان میں ابھی خالی
کئے دیتی ہوں۔ میرے پاس اتنا آیا تھا یہی کہا ہے۔ تمہارے سیٹھ جی سے اگر رات بھر کے
کر دینے کا کیوں نقصان ہو۔ یا کوئی تفل ڈال کیا لگے ہو۔

ایسی کیا جلدی ہے بائی جی، کل اطمینان سے خالی کر دیجئے گا۔

جب خالی ہی کرنا ہے تو کل کا جھگڑا کیوں رکھوں۔ منیم جی آپ جائیے اور تالا لا کر
ڈال دیجئے۔

یہ کہتی ہوئی سوشیلا اندر گئی، بچوں کو کھانا کھلا دیا، ایک روٹی خود آنسوؤں کے ساتھ
نگلی برتن مانجھے۔ پھر ایک بچہ سنگوا کر اس پر مختصر سا سامان لادا، اور بادل پر درد اس گھر
سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگئی جیسے اس نے اتنے ارمانوں سے کئی لیپتوں کے لئے
بنوایا تھا۔ اسوقت دل میں کتنی امنگیں تھیں، اینٹ اول درجہ کی ہو چونا خالص کنکر
کا لکڑ پختہ۔ سیٹھ جی مرحوم تو دن بھر اپنی آڑھت میں رہتے تھے، مزدوروں کی نگرانی اور دیکھ
بھال وہ خود کرتی تھی جس دن مکان تیار ہو گیا اور آبادی کی رسم ادا ہوئی، اس دن کئی
ہزار برہمنوں کا بھوج ہوا تھا۔ سوشیلا کو اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی تھی کہ وہ ایک ہفتہ تک
بیمار رہی۔ اسی گھر سے اتنے ہی دنوں میں کتنی یادیں وابستہ ہو گئی تھیں۔ اسی گھر میں اس
کے دو لڑکے مرے تھے، یہیں اسکے شوہر نے دنیا کو خیرباد کہا۔ مرنے والوں کی

روحیں گویا اس زرد دیوار پر منڈلا رہی ہوں۔ اس کا ایک ایک کونہ گویا اس کے دُکھ سے دُکھی اور اس کے سُکھ سے سُکھی ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ پرانا رفیق آج اس سے ہمیشہ کیلئے جُدا ہو رہا ہے۔

اس نے رات ایک ہمسائے کے گھر میں کاٹی اور دوسرے دن دس روپیہ ماہوار پر ایک گلی میں دوسرا مکان لے لیا۔

(۵)

اس نئے مکان میں ان مصیبت زدوں نے تین مہینے جس عذاب میں کاٹے وہ سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جو ہوادار پُر فضا، وسیع اور ہر موسم میں آرام دہ مکان میں رہنے کا عادی ہو، اس کیلئے یہ نیا مکان تنگ و تاریک زندان خانہ سے کم تکلیف دہ نہ تھا۔ مگر بھلا ہو بیچارے سنت لال کا۔ وہ اپنی قلیل آمدنی میں بھی ان غریبوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا تھا۔ اگر سوشیلا شروع ہی سے افلاس کی عادی ہوتی تو چکی پیستی یا کسی کا کھانا پکا کر گزر کرتی مگر خوشحال ماں باپ کی لاڈلی بیٹی اور خوشحال شوہر کی بیوی، یہ کام اسے ذلیل ہوتے تھے، پھر اپنے مرحوم شوہر کے وقار کا بھی تو خیال تھا، حیثیت سے گر کر رہنے میں کتنی سُبکی تھی۔ لوگ یہی کہتے یہ سیٹھ رام ناتھ کی بیوی ہے کیا تھے آج کیا ہو گئے۔ اس نام کی لاج رکھنی ہی تھی۔ سماج کی سخت گیریوں سے کسی طرح بھی نجات نہیں۔ لڑکی کے دو ایک زیور بچ گئے تھے وہ بھی بک گئے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے تھے تو گھر کا کرایہ ماہوار کہاں سے آتا۔ تین مہینے تک تو مالک مکان نے کسی طرح صبر کیا۔ وہ بھی اسی برادری کا ایک فرد تھا جس نے ضیافت میں خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے تھے اور سوشیلا کی زبوں حالی سے واقف تھا۔ مگر بیچارہ کہاں تک صبر کرتا۔ تیس روپے کا معاملہ تھا۔ روپیہ آٹھ آنے کی بات نہ تھی۔ اتنی بڑی رقم تو نہیں چھوڑی جا سکتی۔

آخر جب چوتھا مہینہ لگ گیا تو ایک دن سیٹھ جی بہ نفس نفیس وارد ہوئے اور سانڈ کی طرح ڈکارتے ہوئے بولے۔ اگر تو کرایہ نہیں دے سکتی تو گھر خالی کر دے۔ میں نے برادری کے ناطے اتنی مروت کی لیکن تو پرواہ نہیں کرتی۔ کھاتی ہے، رہتی ہے، کپڑے پہنتی ہے پھر گھر کا کرایہ دیتے ہوئے کیوں نانی مرتی ہے۔ بیچارے رام ناتھ کی آتما کو بدنام کر رہی ہے۔

سوشیلا ندردناک لہجہ میں بولی۔ میرے پاس روپے ہوتے تو آپ کا کرایہ ادا کر کے تب بانی تھی۔ آپ نے اتنی مروت کی، اس لئے میرا سر آپ کے قدموں پر ہے۔ لیکن ابھی میں بالکل تنگدست ہوں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ بس ایک بھائی میرے بچوں کی پرورش کر رہے ہیں اور کیا کہوں۔

سیٹھ جی گولیاں نہ کھیلے تھے، پورنماشی کو ہمیشہ ست نرائن کی کتھا سنتے تھے اب اور کہاں تک دھرم کے نام کو روتے۔ غضبناک ہو کر بولے۔ چل چل، اس طرح کے بہانے بہت سن چکا ہوں۔ میں برادری کا آدمی ہوں نہ اسلئے چاہتی ہے کہ مجھے چوس لے اگر کوئی اور ہوتا تو تجھے چپکے سے مہینے مہینے کرایہ دیتی، نہیں اس نے نکال باہر کیا ہوتا۔ میں برادری کا ہوں۔ تجھے کرایہ دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے مانگنا ہی نہ چاہئے۔ کیوں برادری کا کے ساتھ بھی سلوک! اسی کے سایہ میں رہتی ہے۔ اسی کی جڑ کھودتی ہے۔

ریوتی بھی کہیں سے کھیلتی ہوئی آ کر کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ جی نے اسے سر سے پاؤں تک مبصرانہ انداز سے دیکھا اور تب ذرا رقیق ہو کر بولے۔ "اچھا تو یہ لڑکی سیانی ہو گئی کہیں اس کی سگائی کی بات چیت نہیں کی۔"

ریوتی شرما کر بھاگ گئی۔ سوشیلا نے ان الفاظ میں ہمدردی کی جھلک پا کر پر اعتماد لہجہ میں کہا ابھی تو کہیں بات چیت نہیں ہوئی۔ سیٹھ جی، گھر کا کرایہ تک تو ادا نہیں کر سکتی۔ سگائی کہاں سے کر دوں۔ پھر ابھی چھوٹی بھی تو ہے۔

سیٹھ جی نے فوراً شاستروں کا حوالہ دیا۔ لڑکیوں کی شادی بارہ سال کے اندر کر دینی چاہئے۔ شاستروں کی یہی منشا ہے۔ دھرم سب کیلئے ایک ہے۔ کیا غریب کیا

ایز اس کا نیرادورتہ کرنا چاہیئے۔ کرایہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر دے دینا، مجھے معلوم نہ تھا کہ سیٹھ رام ناتھ کی کنیا ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔

سوشیلا کو جیسے آنکھیں مل گئیں، بولی۔ تو آپ کی نگاہ میں کوئی اچھا لڑکا ہو یہ تو آپ جانتے ہیں میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں ہے۔

سیٹھ جھابر مل جی (آپ کا یہی مبارک نام تھا) مردانہ حمیت جوش میں آگئی آواز میں قند و شکر گھول کر بولے۔ لینے دینے کی کوئی بات نہیں بائی جی، سیٹھ رام ناتھ بھائی تھے ان کی کنیا کنواری بیٹھی رہے۔ یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایسا گھر ہے کہ لڑکی زندگی بھر آرام سے رہے گی، تمہارا لڑکا بھی وہیں رہ سکتا ہے، اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا، بس یہی سمجھ لو کہ تمہارے نصیب کھل جائیں گے۔ گھرانا بہت ہی شریف اور اونچا ہے ہاں لڑکا دوہاجو ہے۔

"عمر اچھی ہونی چاہیئے، دوہاجو ہونے سے کیا ہوتا ہے۔"

عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ابھی چالیسواں سال ہے دیکھنے میں تیس ہی کا لگتا ہے ہٹا کٹا مضبوط آدمی ہے اور مرد کی عمر تو اس کی غذا ہے اچھی غذا ملتی جائے تو عمر کی پرواہ نہیں، بس یہ سمجھ لو کہ تمہارا بیڑا پار لگ جائے گا۔

سوشیلا تشویشناک لہجے میں بولی۔ اچھا یہ سوچ کر جواب دونگی، ایک بار مجھے دکھا دینا۔

سیٹھ جھابر مل جی مسکرا کر بولے۔ دیکھنے کو کہیں جانا ہے بائی جی! وہ تیرے سامنے ہی کھڑا ہے۔

سوشیلا کے منہ پر طمانچہ سا پڑ گیا۔ نفرت آمیز نظروں سے سیٹھ کو دیکھا یہ پچاس سال کا بوڑھا کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس، سینہ کا گوشت لٹک کر ناف تک آپہنچا ہے ٹھوڑی سینہ کا بوسہ لے رہی ہے، دانت کے ستون جیسے کو ٹھے کے زلزلے میں منہدم ہو گئے

ہیں اور اس پر یہ بڑھ بیس، یہ احمق سمجھتا ہے کہ میں لالچ میں آکر اپنی بھولی سی لڑکی اس کے گلے میں باندھ دوں گی، میں اسے عمر بھر کنواری رکھوں گی پر اس مرد کے ساتھ اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد نہ کر دوں گی۔ مگر اس نے ضبط کیا۔ یہ زمانہ کی خوبی ہے۔ کہ ایسے کھوسٹوں کو اس کی بے کسی کو ذلیل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

بولی۔ آپ کی اس عنایت کیلئے آپکی مشکور ہوں سیٹھ جی۔ مگر میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے نہیں کر سکتی۔

جھابر مل تند ہو کر بولے تو اور تو کیا سمجھتی ہے کہ تیری لڑکی کیلئے برادری میں کنوارا لڑکا مل جاوے گا۔

"تو میری لڑکی کنواری ہی رہے گی۔"

"اور سیٹھ رام ناتھ کے نام کو داغ لگائے گی۔"

"نام کیلئے اپنی ساری جائیداد کھوئی۔ زیور کھوئے، مکان کھویا۔ لیکن لڑکی کو کنوئیں میں نہیں ڈال سکتی، نام رہے یا جائے۔"

"تو پھر میرا کرایہ اسی وقت دیدے۔"

"ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

جھابر مل اسی غیظ کے عالم میں مکان کے اندر گھس گئے اور خانہ داری کی ایک ایک چیز نکال کر گلی میں پھینک دی۔ گھڑا پھوٹ گیا، مٹکے چور چور ہو گئے۔ برتن ٹوٹ گئے۔ صندوق کے کپڑے بکھر گئے، پتھروں کو چونا کر دیوتی نے کھیلنے کیلئے خوب صورت سی گڑیا بنا رکھی تھی اس کے اعضا منتشر ہو گئے اور اسکے رنگے ہوئے اس اُڑ گئے، سوشیلا ایک بے بسی کے عالم میں دور کھڑی اپنی تباہی کا یہ جگر دوز نظارہ دیکھتی رہی۔ گھر کو خاک میں ملا کر جھابر مل نے مکان میں قفل ڈال دیا اور عدالت سے روپے وصول کرنے کی دھمکی دے کر چلے گئے۔

(۴)

بڑوں کے پاس دولت ہے چھوٹوں کے پاس دل ہوتا ہے، دولت سے عالیشان محل بنتے ہیں، عیاشیاں ہوتی ہیں مقدمہ بازیاں کی جاتی ہیں، رعب جتایا جاتا ہے اور انسانوں کو کچلا جاتا ہے، دل سے ہمدردی ہوتی ہے، زخم پر مرہم رکھا جاتا ہے اور آنسو نکلتے ہیں۔

اسی مکان سے ملی ہوئی ایک سبزی والی کنجڑن کی دوکان تھی، بوڑھی، بیوہ، ضعیف بے اولاد تھی، ظاہر میں آگ، باطن میں پانی جھابرمل کو خوب صلواتیں سنائیں اور سوشیلا کی ٹوٹی پھوٹی بکھری ہوئی کام کی چیزوں کو سمیٹ کر اپنے گھر میں لے گئی، اور پیار سے بولی، تم چل کر میرے گھر میں رہو، بیوہ لاخطر میں آ گئی نہیں تو موذی کی مونچھیں اکھاڑ لیتی، موت سر پر ناچ رہی ہے آگے نا تھ نہ پیچھے پگھا، مولی پیسے گننے مراجاتا ہے جانے چھاتی پر لاد کرلے جائیگا، چار دن میں گنگا میں جائینگے، انہیں بیاہ کی دھن سوار ہے پیسہ پا کر آدمی کی آنکھیں بھی اندھی ہو جاتی ہیں کیا، تم آرام سے گھر میں رہو میرے ہاں کسی بات کا کھٹکا نہیں، بس میں اکیلی ہوں، ایک ٹکڑا مجھے بھی دے دینا۔

سوشیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ماتاجی میرے پاس ان ٹوٹے پھوٹے سامانوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کرایہ کہاں سے دوں گی۔

بڑھیا مادرانہ شفقت سے بولی، میں جھابرمل نہیں ہوں بیٹی، نہ کبیر داس ہوں میں تو رکھتی ہوں اچھے برے دن سب کے آتے ہیں، سمجھ میں اترا و مت، دکھ میں گھبراؤ مت تمہیں اس دن بھی دیکھا تھا جب تم محل میں رہتی تھیں، اور آج بھی دیکھ رہی ہوں، جب تم اناتھ ہو، جو مزاج جب وہی اب ہے، میرے دھن بھاگ کہ تم میرے گھر میں آؤ میری آنکھیں کیا پھوٹ گئی ہیں کہ میں تم سے کرایہ مانگنے جاؤں گی۔

ان تشفی سے بھرے ہوئے الفاظ نے سوشیلا کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس نے آج دیکھا سچی انسانیت اور محبت غریبوں، رذیلوں ہی میں رہتی ہے، بڑوں کا دل بھی بڑا ہوتا ہے تکبر اور خود نمائی سے پُر۔

اس کنجڑن کے ساتھ رہتے سوشیلا کو چھ مہینے ہو گئے تھے، اس کی مادرانہ الفت میں سوشیلا کا اپنا رنج و غم بہت کچھ بھول گیا تھا۔ وہ جو کچھ پانی لاکر سوشیلا کے ہاتھ پر رکھ دیتی دونوں بچے اسکی دو آنکھیں تھیں، مجال نہ تھی کہ پڑوس کا کوئی آدمی انہیں ترچھی آنکھوں سے دیکھ بھی سکے، بڑھیا آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ رسنت لال ہر مہینے کچھ نہ کچھ لا دیا کرتا تھا۔ اسے فراغت کیساتھ گذر ہو جاتی تھی، سوشیلا گھر کی مالکن تھی کاتک کا مہینہ تھا، فصلی بخار پھیلا ہوا تھا۔ موہن ایک دن ہنستا کھیلتا بیمار پڑ گیا۔ اور تین دن تک بے ہوش پڑا رہا۔ بخار اتنی شدت کا تھا کہ پاس کھڑے ہونے سے لپٹ سی لگتی تھی۔ سوشیلا کو ٹائیفائیڈ کا اندیشہ تھا۔ اسکی جان سوکھی جاتی تھی، کیا کرے، کس سے کہے۔

پانچویں دن اس نے ریوتی سے کہا۔ بیٹی تو نے سیٹھ جی کا گھر دیکھا ہے، جا کر ان سے میرا پرنام کہنا اور کہنا بھیا کو پانچ دن سے زور کا بخار ہے، چھن بھر کو بھی نہیں اترتا۔ کوئی ڈاکٹر بھیج دیجئے۔

ریوتی کو کہنے کی دیر تھی، دوڑی ہوئی سیٹھ کبیر داس کے پاس گئی۔ کبیر داس نے حال سُنا اپنے منیم سے بولے ایسا حکم بھیجتی ہے جیسے ہم اس کے باپ کا نوکر ہی تو ہوں۔ کھانے کو ٹھکانا نہیں، انہیں ڈاکٹر چاہیئے، چڑیل۔

ریوتی سے بولے، جا کر کہدے، ڈاکٹر کی فیس سولہ روپے ہوگی، راضی ہو تو وہ بھیج دوں۔ ریوتی نے دل شکستہ ہو کر کہا۔ اماں کے پاس روپے کہاں ہیں سیٹھ جی! کبیر داس جھڑک کر بولے، تو پھر کس منہ سے ڈاکٹر بھیجنے کو کہتی ہے تیرا ماموں

کہاں ہے اس سے جا کر کہہ، میوا سمتی سے کوئی ڈاکٹر بلا لے جا۔ یا خیراتی ہسپتال میں کیوں نہیں لڑکے کو لے جاتی یا ابھی وہی پُرانی تو سمائی ہے کتنی بے سمجھ عورت ہے گھر میں لگا نہیں، ڈاکٹر کی فرمائش کر دی، فیس سیٹھ جی دینگے، سیٹھ جی کیوں فیس دیں، پنچایت کا مال دھرم کاج کیلئے ہے۔ یوں اُڑانے کیلئے نہیں شہر کے لاکھوں آدمی اسپتال میں اچھے ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ کہاں کی بڑی رانی ہیں، ابھی بھاگوت کی کتھا بیٹھنے والی ہے کئی ہزار کا خرچ ہے۔ اس طرح ہر ایک کیلئے ڈاکٹر بھیجنے لگوں تو ثواب کا کوئی کام ہی نہ ہو۔

ریوتی آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹی، مگر جو کچھ سُنا تھا وہ کہہ کر ماں کے زخم پر نمک نہ چھڑکنا چاہتی تھی۔ بہانہ کر دیا سیٹھ جی ملے نہیں کہیں باہر گئے ہیں۔

سُوشیلا نے ڈانٹ کر کہا تو نے منیم جی سے کیوں نہیں کہا۔ یہاں کوئی مٹھائی رکھی تھی جو دوڑی ہوئی آ گئی۔

اسی وقت سنت لال ایک وید کو لے کر آئے۔

(۷)

مگر وید جی ایک دن آکر دوسرے دن نہ لوٹے، جب پوری فیس کی جگہ آدھی بھی نہ ملے اور نہ اس تعلق سے کسی موٹے مریض کے پھنسنے کی اُمید ہی ہو تو پھر وہ کس تحریک سے روز آئیں سیوا سمتی کے ڈاکٹر صاحب بھی دو دن بڑی عنایت سے آئے پھر اُنہیں بھی فرصت نہ رہی، جھابر مل کو بخار آنے لگا تھا اور جھابر مل برادری کے ذی اثر آدمی تھے ان کے معالجے میں ہر طرح کا فائدہ تھا۔

ادھر موہن کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی ایک مہینہ یوں ہی گذر گیا مگر بخار نے اُترنے کا نام نہ لیا، پیر تسمہ پا کی طرح گردن پر سوار ہو گیا تھا کہ ٹلتا تک

نہ تھا۔ موہن کا چہرہ اتنا زرد اور افسردہ ہو گیا تھا۔ گویا خون کا ایک قطرہ جسم میں نہ ہو، اُسے دیکھ کر رحم آتا تھا۔ لمبا سا چہرہ نکل آیا تھا جس سے طفلانہ بیکسی روتی ہوئی معلوم ہوتی ہے نہ کچھ بولتا نہ کہتا یہاں تک کہ کچھ سنتا بھی نہ تھا، پڑا پڑا اپنے نور آنکھوں سے چھت کی طرف تاکتا رہتا، پڑے پڑے جلد میں خراش ہو گیا تھا، سر کے بال گر گئے تھے ہاتھ پاؤں لکڑی جیسے، چارپائی پر ایسا سمٹا ہوا تھا گویا ہے ہی نہیں، تصویر مٹ گئی فقط اسکا عکس باقی تھا۔ ماں رات دن اُسکی تیمارداری میں لگی رہتی بڑھیا بھی دعائیں دیا کرتی مگر تیمارداری اور دعا سے دوا کا کام تو نہیں ہو سکتا۔

ایکدن شام کیوقت موہن کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ سوشیلا تو پہلے ہی سے ٹھونک رہی تھی، یہ حالت دیکھی تو چھاتی پیٹنے لگی۔ ماں سے بے بسی میں کچھ اور نہ سوجھا کھڑی ہو گئی اور موہن کی کھاٹ کے گرد سات بار گھوم کر دست بدعا ہو کر بولی بھگوان یہی میری اس جنم کی کمائی ہے اپنا سب کچھ کھو کر بھی اپنے لال کو چھاتی سے لگائے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر تھی یہ چوٹ نہ سہی جائے گی تم اسے اچھا کر دو، اُسکے بدلے مجھے اُٹھا لو بس میں تمہاری اتنی ہی دیا چاہتی ہوں۔

غیب کے کرشمے کون سمجھ سکتا ہے کیا ہم میں سے بہتیروں کو اس کا تلخ تجربہ نہیں کہ جس دن ہم نے بے ایمانی سے کوئی رقم اڑا دی اسی دن ہمیں اس رقم کا دگنا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اسے اتفاق کہو یا دعا کا اثر، اسی رات کو موہن کا بخار اتر گیا اور سوشیلا کو بخار آگیا۔ بچے کی تیمارداری میں آدھی تو یوں ہی ہو رہی تھی، بخار نے ایک ہی جھٹکے میں بستر مرگ پر سلا دیا۔ معلوم نہیں دیوتا بیٹھے سن رہے تھے یا کیا اسکی دعا حرف بحرف پوری ہوئی تیسرے دن موہن چارپائی سے اُٹھا اور ماں کے پاس جا کر اسکی چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ طویل بیماری کے بعد ہم میں ایک روشن ضمیری آجاتی ہے اس سے اُسے آنے والے سانحہ کا الہام سا ہو گیا تھا۔ ماں نے اُسے چھاتی سے لگا لیا اور بولی کیوں روتے ہو بیٹا میں

اچھی ہو جاؤں گی جب تم بھگوان نے اچھا کر دیا تو مری کیا فکر دہی بھگوان تمہارے ماتا پتا ہیں دہی تمہاری پرورش کرینگے اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ بہت جلد اچھی ہو جاؤ نگی۔

موہن سسکیاں بھر کر بولا۔ جیا کہتی ہے اماں اچھی نہ ہوں گی۔

سوشیلا نے بچہ کا بوسہ لے کر کہا۔ جیا پگلی ہے۔ اسے کہنے دو میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤنگی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ہاں جسدن تم کسی کو ستاؤ گے۔ کسی کا دل دکھاؤ گے اپنی نیت خراب کروگے۔ کسی کی کوئی چیز چرا لوگے اسی دن میں مر جاؤں گی۔

موہن خوش ہو کر بولا۔ میں کبھی کسی کی چیز نہ چراؤں گا۔ اماں کبھی کسی کو گالی نہ دوں گا تم میرے ساتھ ہمیشہ رہو گی نہ؟

ہاں بیٹا ہمیشہ۔

اسی رات کو مصیبت کی ستائی ہوئی وہ غم نصیب بیوہ دونوں یتیم بچوں کو خدا کے سائے میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

(۸)

اس سانحہ کو تین سال ہو گئے۔ موہن اور پوتی ابھی تک اس پاک نفس کنجڑن کے پاس رہتے ہیں۔ بڑھیا ماں تو نہیں ہے۔ مگر ماں سے بڑھ کر ہے۔ روز علی الصباح موہن کو باسی روٹیاں مکھن کے ساتھ کھلا کر گورجی کی پاٹھ شالہ میں پہنچا آتی ہے چھٹی کے وقت خود جا کر لے آتی ہے۔ ریوتی کا چودھواں سال ہے۔ وہ گھر کا سارا کام سینا۔ پرونا۔ چوکا۔ برتن، جھاڑو کرتی ہے اور اس کا من ذرا بھی میلا نہیں ہوتا۔ جب بڑھیا سودا لے کر بازار چلی جاتی ہے تو وہ دکان پر آ کر بیٹھتی ہے۔

ایکدن بڑے سیٹھ گنبیر داس نے اسے بلا بھیجا اور بولے کیوں ری تو اتنی سیانی ہو گئی تجھے کنجڑن کی دوکان پر بیٹھتے شرم نہیں۔ ساری برادری کی ناک کٹوا دی ہے

خبردار جو کل سے دکان پر بیٹھی، میں نے۔ تیری شادی کیلئے سیٹھ جھابرمل جی کو پکا کر لیا ہے۔ رانی بن جائے گی رانی۔

سیٹھانی نے تائید کی۔ تو اب سیانی ہوئی بیٹی، تیرا اب اسطرح دکان پر بیٹھنا اچھا نہیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں، تہمت لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ بڑی مشکل سے جھابرمل جی کو راضی کیا ہے۔ کہتے تھے ایسی بلاتی چھوکری سے شادی کر کے بدنامی مول لے۔ مگر ہم نے بہت سمجھا بجھا کر انہیں سیدھا کیا ہے۔ بس تو سمجھ لو کہ بھاگ جاگ جائے لاکھوں کی جائیداد ہے۔ لاکھوں کی، تیرے دھن بھاگ کہ ایسا بر ملا، تیرا چھوٹا بھائی ہے لسے بھی پڑھا لکھا کر دکان کرا دی جائے گی۔

سیٹھ نے بیٹیانی کو اوپر چڑھا کر کہا، برادری کی کتنی ہنسی ہو رہی ہے۔

سیٹھانی نے تصدیق کی۔ ہے ہی۔

ریوتی نے لجا کر کہا، میں کیا جانوں، یہ سب آپ ماما سے کہیں۔

کبیر داس بگڑ کر بولے، ماما کون ہوتا ہے، ٹکے کا آدمی، اس سے کیا پوچھوں میں برادری پنچ ہوں مجھے اختیار ہے کہ جس کام میں برادری کی بہتری دیکھوں وہ کروں۔ میں نے اور پنچوں سے رائے لے لی ہے سب راضی ہیں اگر تو ماننے گی تو ہم عدالتی کارروائی کرینگے آپ تیرا ہی سامان، تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں خرچ برت کیلئے کچھ درکار ہو تو یہ ہیں۔ یہ کہکر انہوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ صندوق سے نکال کر ریوتی کیطرف پھینک دیا، ریوتی نے اٹھا کر دہیں پرزے پرزے کر ڈالا اور تمتماتے ہوئے منہ سے بولی، برادری نے اسوقت ہماری بات نہ پوچھی، جب ہم روٹیوں کے محتاج تھے میری بدنصیب ماں مر گئی برادری کا کوئی آدمی جھانکنے تک نہ آیا، میرا بھائی بیمار ہوا کسی نے خبر تک نہ لی۔ ایسی برادری کی مجھے پرواہ نہیں۔

ریوتی چلی گئی تو جھابرمل پاس کی کوٹھری سے نکل آئے جہاں وہ پہلے ہی سے

چھپے بیٹھے تھے۔ چہرے پر حجابانہ بھری ہوئی تھی۔

مسز کبیر داس بولیں، لڑکی کتنی گھمنڈن ہے۔ آنکھ کا پانی مر گیا۔

جھابر مل نے نوٹ کے پرزے چنتے ہوئے رونا منہ بنا کر کہا، پچاس روپوں پر پانی پھر گیا۔ سسری نے ایسا پھاڑا ہے کہ جوڑ بھی نہیں سکتے۔

کبیر داس نے ان کے آنسو پونچھے۔ تم گھبراؤ نہیں جھابر مل جی۔ اسے عدالت سے ٹھیک کروں گا جاتی کہاں ہے۔

جھابر مل نے دانت نکال کر کہا جب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے۔

برادری کے بڑے پنچ نے یہ الفاظ محض عتاب میں نہ کہے تھے۔ انہوں نے جلدی ہی عملی کارروائی شروع کر دی اور قانون نے ان کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ ریوتی نابالغ تھی اور یتیم ایسی حالت میں پنچوں کو اس کی نگرانی اور حفاظت کا استحقاق تھا۔ وہ برادری کی لونڈی بن کر نہیں رہنا چاہتی نہ چاہے، اس کی سنتا کون ہے۔ قانون برادری کے حقوق کو کیونکر پامال کر سکتا ہے۔

سنت لال نے یہ ماجرا سنا تو غصہ ضعیف کے عالم میں دانت پیس کر بولے یہ برادری نہ جانے کب جہنم میں جائے گی۔ ریوتی نے تیوریاں چڑھا کر کہا تو برادری مجھے جبراً اپنی حمایت میں لے سکتی ہے۔

"ہاں بیٹی جس کے ہاتھ میں روپے ہیں اسی کے ہاتھ میں قانون بھی ہے۔"

"میں صاف کہہ دوں گی۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

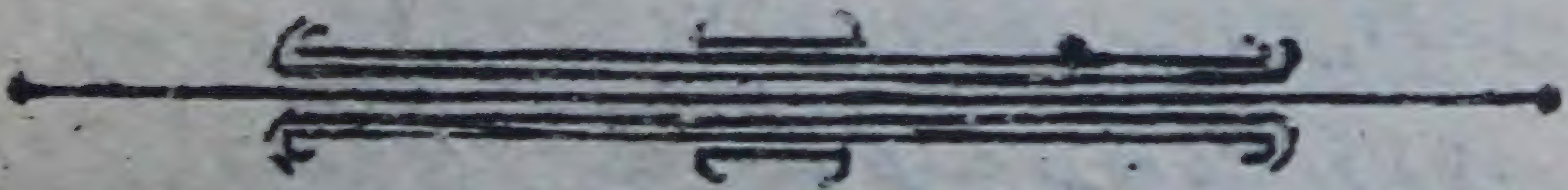
"تیرے کہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ تیری تقدیر میں یہی لکھا ہے تو اس کا کیا علاج ایسی برادری میں پیدا ہونے کی یہی سزا ہے۔" ایک لمحہ کے بعد وہ کھڑا ہو کر بولا۔

"میں جاتا ہوں سیٹھ کبیر داس کے پاس۔"

"نہیں ماما جی! تم کہیں نہ جاؤ، جب بھاگ کا ہی بھروسہ ہے تو جو کچھ بھاگ میں ہوگا۔"

رات تو ریوتی نے کروٹیں بدل کر اور رو کر کاٹی۔ بار بار نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے پیارے بھائی کو گلے لگاتی اور روتی، یہ اناتھ اکیلے کیسے رہے گا، یہ سوچ کر اس کا دل کمزور ہو جاتا مگر جھابر مل کی وہ منحوس صورت دیکھ کر اس کا عزم پھر قوی ہو جاتا
علی الصباح ریوتی گوگل اشنان کرنے گئی۔ ادھر کئی مہینوں سے اس کا یہ روز کا معمول تھا۔ آج ذرا اندھیرا تھا، پر یہ کوئی کھٹکے والی بات نہ تھی، شبہ تو جب ہوا جب آٹھ بج گئے اور وہ لوٹ کر نہ آئی۔ تیسرے پہر تک ساری برادری میں خبر پھیل گئی "سیٹھ رام ناتھ کی کنیا گنگا میں ڈوب گئی"۔ اسکی لاش معائنہ کیلئے پولیس اٹھا لے گئی۔
کبیر داس بولے۔ چلو جھگڑا پاک ہوا، برادری کی بدنامی تو نہ ہو گی۔
جھابر مل نے مایوسانہ انداز سے کہا "میں تو لٹ گیا سیٹھ جی، میرے لئے اب کوئی اور راستہ نکالئے۔

ادھر موہن سر پیٹ پیٹ کر رو رہا تھا۔ اور بڑھیا اسے سمجھا رہی تھی، بیٹا اس دیوی کیلئے کیوں روتے ہو۔ زندگی میں اس کیلئے کون سا سکھ تھا۔ اب وہ اپنی ماں کی گود میں آرام کر رہی ہے۔ ان پنچوں کا ستیاناس جائے۔ میری لاڈلی کی جان ہی لے کر چھوڑی۔
موہن معصومانہ سادگی سے بولا۔ یہ لوگ جیا کو کیوں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے ماں میری خبر کیوں نہیں لیتے۔ میری پڑھائی کا کیوں نہیں انتظام کرتے۔
بڑھیا نے اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بولی۔ تم میری آنکھوں کے تارے ہو بیٹا۔



حقیقت

وہ راز امرت کے دل میں سربستہ ہی رہا۔ پورنما کو اس کی نظروں سے باتوں سے یا قیافے سے کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا کہ امرت کو اس سے معمولی ہمسائیگی اور بچپن کی دوستی کے سوا اور کوئی تعلق بھی ہے یا ہو سکتا ہے، بیشک جب وہ گھڑا لے کر کنویں پر پانی کھینچنے جاتی تو امرت خدا جانے کہاں سے آ جاتا اور گھڑا اس کے ہاتھ سے بزور لے کر پانی کھینچ دیتا، جب وہ اپنی گائے کو سانی دینے لگتی تو وہ اس کے ہاتھ سے بھوسے کی ٹوکری لیتا اور گائے کی ناند میں سانی ڈال دیتا، بنئے کی دکان پر کوئی چیز لینے جاتی تو امرت اکثر مل جاتا اور اس کا کام کر دیتا۔

پورنما کے گھر میں کوئی دوسرا لڑکا یا آدمی نہ تھا۔ اس کے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ماں پردے میں رہتی تھی، امرت پڑھنے لگتا تو پورنما کے گھر جا کر پوچھ لیا کرتا، بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں ہے، اس کے گھر میں کھیتی باڑی ہوتی تھی، گائے بھینسیں تھیں، باغ بغیچے تھے۔ گھر والوں کی نظر بچا کر وہ فصل کی چیزیں سوغات کے طور پر پورنما کے گھر دے

آتا۔ مگر پورنما ان خاطر داریوں اس کی شرافت اور مرچشتی کے سوا اور کیا سمجھے اور کیوں سمجھے ایک گاؤں میں رہنے والے چاہے خونی تعلق نہ رکھتے ہوں مگر گاؤں کے رشتے سے بہن بھائی تو ہوتا ہی ہے ان خاطر داریوں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

ایک دن پورنما نے اس سے کہا بھی تم دن بھر مدرسے میں رہتے ہو میرا جی گھبراتا ہے

امرت نے سادگی سے کہا، کیا کروں، امتحان قریب ہے۔

" میں سوچا کرتی ہوں جب میں چلی جاؤں گی تو تمہیں کیسے دیکھوں گی اور تم کیوں میرے گھر آؤ گے "

" امرت نے گھبرا کر پوچھا۔ کہاں چلی جاؤ گی تم ؟"

پورنما لجا گئی، پھر بولی، جہاں تمہاری بہنیں چلی گئیں، جہاں سب لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔

امرت نے حسرت کے ساتھ کہا۔ اچھا وہ بات اور خاموش ہو گیا، اس وقت تک یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ پورنما کہیں چلی جائے گی، اتنی دور تک سوچنے کی اسے مہلت ہی نہ تھی، مسرت تو حال میں ہی مست رہتی ہے، آئندہ سوچنے لگے تو مسرت ہی کیوں رہے۔

اور یہ سانحہ اس سے جلد رونما ہو گیا جس کا امرت کو گمان ہو سکتا، پورنما کے لئے ایک پیغام آ گیا۔ متمول خاندان تھا اور ذی عزت، پورنما کی ماں نے اُسے بڑی خوشی سے منظور کر لیا عسرت کی اس حالت میں اس کی نظروں میں دنیا کی جو چیز سب سے زیادہ تھی وہ دولت تھی اور یہاں پورنما کیلئے فارغ البال زندگی کیلئے سارے سامان موجود تھے، اسے جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ فکروں سے گھلی جا رہی تھی، لڑکی کی شادی کا خیال آتے ہی اختلاج قلب ہونے لگتا تھا گویا غیب نے ابرو کی ایک جنبش سے اس کی ساری فکروں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا۔

امرت نے سُنا تو دیوانہ ہوگیا بے تحاشا پورنما کے گھر کی طرف دوڑا، مگر پھر لوٹ پڑا، جوش نے پاؤں روک دیئے، کیا فائدہ۔ اس کی کیا خطا؟ کسی کی بھی کیا خطا؟ اپنے گھر آیا، اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہا، پورنما چلی جائے گی، پھر وہ کیسے رہے گا؟ ہیجان سا ہونے لگا۔ وہ زندہ ہی کیوں رہے، زندگی میں رکھا ہی کیا ہے، مگر یہ ہیجان بھی فرد ہوگیا اور اس کی جگہ کی اس سکون نے جو طوفان کے بعد آتا ہے وہ جاتیار ہوگیا۔ جب پورنما جاتی ہے تو وہ اب اس سے کیوں کوئی تعلق رکھے، کیوں ملے جلے، اور اب پورنما کو اس کی پرواہ ہی کیوں ہونے لگی اور پرواہ تھی ہی کب، وہ خود ہی کتوں کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا رہتا تھا۔ پورنما نے تو کبھی بات بھی نہیں پوچھی اور اب اسے کیوں نہ غرور ہو، ایک لکھ پتی کی بیوی بننے جارہی ہے، شوق سے بنے، امرت بھی زندہ رہے گا، رہے گا نہیں، یہی اس زمانے کی رسم وفا ہے۔

مگر یہ ساری شورش دل کے اندر تھی، بے عمل، اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ جا کر پورنما کی ماں سے کہہ دے "پورنما میری ہے اور میری رہے گی" غضب ہو جائے گا۔ گاؤں میں کہرام مچ جائے گا ایسا واقعہ گاؤں کی روایتوں نے کبھی سُنا ہے اور نواحات نے کبھی دیکھا ہے۔

اور پورنما کا یہ حال تھا کہ دن بھر اس کی دیکھا کرتی، وہ کیوں اس کے دروازے سے ہو کر نکل جاتا ہے۔ اندر نہیں آتا، کبھی راستہ میں ملاقات ہو جاتی ہے تو جیسے اس کے سائے سے بھاگتا ہے۔ وہ کلسا لے کر کنوئیں پر کھڑی رہتی ہے کہ وہ آتا ہوگا، مگر وہ نظر نہیں آتا۔

ایک دن وہ اس کے گھر گئی اور اس کے پاس جا کر جواب طلب کیا، تم آج کل آتے کیوں نہیں اور اس کا گلا بھر گیا۔ اسے یاد آیا کہ اب وہ گاؤں میں چند دنوں کی مہمان ہے۔

مگر امرت بے حس بیٹھا رہا، بے اعتنائی سے نہ صرف اتنا بولا، امتحان قریب ہے فرصت نہیں ملتی۔

"سوچتا ہوں جب تم جا رہی ہو"......

وہ کہنا چاہتا تھا: "تو اب محبت کیوں بڑھاؤں" مگر خیال آ گیا کتنی احمقانہ گفتگو ہے۔ کوئی مریض مرنے جا رہا ہو گیا اس خیال سے اس کا معالجہ چھوڑ دیا جاتا ہے اس کے برعکس جوں جوں اس کی حالت دگرگوں ہوتی ہے لوگ اور بھی زیادہ انہماک یاس کے ساتھ دوا دارو کرتے ہیں اور نزع کی حالت میں تو جدوجہد کی انتہا ہی نہیں رہتی۔ گفتگو کا پہلو بدل کر بولا۔ سنا ڈنلپ بھی بڑے مالدار ہیں۔

پھر نرمل نے یہ آخری الفاظ شاید سنے ہی نہیں یا ان کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی اس کے کانوں میں تو جواب کا پہلا حصہ ہی گونج رہا تھا۔

دردناک لہجہ میں بولی۔ اس میں میری کیا خطا ہے میں اپنی خوشی سے تو نہیں جا رہی ہوں جانا پڑتا ہے اس لئے جا رہی ہوں۔

یہ کہتے کہتے شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا، یقینا اسے کہنا چاہئے تھا شاید اس سے زیادہ کہہ گئی، محبت میں بھی شطرنج کی سی چالیں ہوتی ہیں۔

امرت نے اس کی طرف اس طرح دیکھا، گویا تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ ان لفظوں میں کچھ معنی بھی ہیں یا نہیں، کاش ان آنکھوں میں دل کا راز دیکھنے کی طاقت ہوتی اس طرح تو سبھی لڑکیاں مایوسانہ گفتگو کرتی ہیں۔ گویا شادی ہوتے ہی ان کی جان پر بن جائے گی، مگر سبھی ایک دن اچھے اچھے گہنے پہن کر اور پالکی میں چلی جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے ان کی کچھ تشفی نہ ہوئی، ڈرتے ڈرتے بولا۔ تب تمہیں میری یاد کیوں آئے گی۔

اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا، ایسی وحشت خیز ندامت ہوئی کہ کمرے سے باہر

بھاگ جائے۔ پورنما کی طرف تاکنے کی بھی جرأت نہ ہوئی کہیں وہ یہ نہ سمجھ گئی ہو۔

پورنما نے سر جھکا کر جیسے اپنے دل سے کہا، تم مجھے اتنی نرموہنی سمجھتے ہو۔ تم جو مجھ سے بے قصور روٹھتے ہو، تمہیں اس وقت مجھ سے ہمدردی کرنا چاہئے مجھے تشفی دینی چاہئے اور مجھ سے تنے بیٹھے ہو۔ تمہیں بتاؤ، میرے لئے دوسرا کون سا راستہ ہے اپنے بزرگوں کے گھر بھیجے دے رہے ہیں وہاں مجھ پر کیا گذرے گی، میری کیا حالت ہوگی۔ یہ غم میری جان لینے کیلئے کافی نہیں ہے کہ تم اس میں اپنا غصہ بھی حل کر دو۔

اس کا گلا بھر بھر آیا۔ آج امرت کو اس ملامت میں پورنما کے سوز نہاں کا یقین ہوا اور اپنی کم ظرفی اور نفس پروری گویا کالکھ بن کر اس کے چہرے پر جھلکنے لگی، پورنما کے ان الفاظ میں پوری صداقت تھی اور کتنی سرزنش اور کتنا اپنا پن، بزرگوں سے کوئی کیوں شکوہ کرے بیشک اس حالت میں پورنما کی دلجوئی کرنی چاہیئے تھی اس کا فرض تھا اور اسے یہ فرض خندہ پیشانی سے پورا کرنا چاہیئے تھا۔ پورنما نے محبت کا ایک نیا معیار اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کا ضمیر اس معیار سے انحراف نہ کر سکتا تھا۔ پرلنک محبت ایک بے نفس قربانی ہے طویل اور جگر دوز اس نے پشیمان ہو کر کہا مجھے معاف کرو پورنما میری غلطی تھی، بلکہ حماقت۔

(۴)

پورنما کی شادی ہو گئی۔ امرت جان دل سے اس کے اہتمام میں مصروف رہا۔ دولہا اڈیٹر تھا تو ندل کر، اور اس کے ساتھ ہی بڑا مغرور اور بدمزاج۔ لیکن امرت اس انہماک سے اس کی خاطرداری کر رہا تھا گویا وہ کوئی دیوتا ہے اور اس کا ایک تبسم اسے جنت میں پہنچا دے گا پورنما سے بات چیت کرنے کا امرت کو موقع نہ ملا۔ اور نہ اس نے موقع

پیدا کرنے کی کوشش کی وہ پورنما کو جب دیکھتا روتے ہی دیکھتا اور آنکھوں کی زبان خاموشی سے جتنی دلجوئی اور ہمدردی تشفی ممکن تھی وہ کرتا رہتا تھا۔

تیسرے دن پورنما دھو کر رخصت ہو گئی، امرت نے اس دن شیو مندر جا کر سچی عقیدت سے بھرے ہوئے دل سے دعا کی کہ پورنما ہمیشہ سکھی رہے، غم کی تازگی میں خام خیالات کا کہاں گذر، غم تو روحانی امراض کا ازالہ ہے مگر دل کے اندر اسے ایک ہمہ گیر سونے پن اور خلا کا احساس ہو رہا تھا گویا اب زندگی ویران ہے۔ اس کا کوئی مقصد اور مدعا نہیں۔

تین سال کے بعد پورنما پھر میکے آئی، اس دوران میں امرت کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ زندگی کا جوا گردن پر رکھے لکیر پیٹتا چلا جا رہا تھا، مگر ایک موہوم سی تمنا جسکی کوئی واضح صورت وہ نہ بتا سکتا تھا، تھرما میٹر کے پارے کی طرح اس کے اندر محفوظ تھی پورنما نے آکر اس میں حرارت ڈال دی اور پارہ چڑھ کر سام کی حد تک جا پہنچا۔ اس کی گود میں ایک دو سال کا پیارا بچہ تھا۔ امرت اس بچے کو سارے دن گلے باندھے رہتا صبح شام اسے گود میں لے کر ٹہلانے لے جاتا اور اس کے لئے بازار سے طرح طرح کے کھلونے اور مٹھائیاں لاتا، صبح ہوتے ہی اس کے ناشتے کے لئے حلوا اور دودھ لے کر پہنچ جاتا۔ اسے نہلاتا، دھلاتا، اس کے بال صاف کرتا اس کے پھوڑے پھنسیوں کو دھوتا مرہم رکھتا، یہ ساری خدمات اس نے اپنے سر لے لی، بچہ بھی اس سے اتنا ہل گیا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا گھر نہ چھوڑتا، یہاںتک کہ کبھی کبھی اس کے ساتھ سو جاتا اور پورنما کے آنے بلانے پر بھی اس کے ساتھ نہ جاتا۔

امرت پوچھتا۔ تم کس کے بیٹے ہو۔

بچہ کہتا شلمے

اور امرت مسرت سے خوش ہو کر اسے جگر سے چمٹا لیتا۔

پورنما کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ کلی کھل کر پھول ہو گئی تھی، اب اس کے مزاج میں خودداری اور تمکنت تھی۔ اور سنگار سے عشق، طلائی زیوروں سے سج کر اور ریشمی ساڑی پہن کر اب وہ پہلے سے کہیں جاذب نظر ہو گئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، امرت سے احتراز کرنا چاہتی ہے۔ بلا کسی خاص ضرورت کے اس سے بہت کم بولتی اور وہ بھی اس انداز سے گویا اس پر کوئی احسان کر رہی ہو، امرت اس کے بچہ پر کس قدر جان دیتا ہے اور اس کی فرمائشوں کی کیسی تندہی سے تعمیل کرتا ہے لیکن بظاہر اس کی نگاہوں میں ان باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی، گویا یہ امرت کا فرض ہے اور اسے ادا کرنا چاہیئے اس کے لئے وہ کسی شکریے اور احسان کا حقدار نہیں۔

بچہ روتا ہے تو وہ دھمکا دیتی ہے، خبردار رونا نہیں، ورنہ ماموں تم سے کبھی نہ بولیں گے۔ اور بچہ خاموش ہو جاتا۔

اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ امرت کو بلا کر تحکمانہ انداز سے کہہ دیتی ہے اور امرت فوراً تعمیل کرتا ہے، گویا اس کا غلام ہو، وہ بھی شاید سمجھتی ہے کہ اس نے امرت سے غلامی لکھائی ہے۔

کچھ مہینے میکے رہ کر پورنما سسرال چلی گئی۔ امرت اسے پہنچانے اسٹیشن تک آیا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تب امرت نے بچہ کو اس کی گود میں دے دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی بوند ٹپک پڑی۔ اس نے منہ پھیر لیا اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آنسو پونچھ ڈالے۔ پورنما کو اپنے آنسو کیسے دکھائے کیونکہ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل نہ مانتا تھا۔ نہ جانے پھر ملاقات کب ہو۔

پورنما نے تمکنت کے ساتھ کہا، بچہ کئی دن تک تمہارے لئے بہت پھڑکے گا۔

امرت نے بھرے ہوئے گلے سے کہا۔ مجھے تو عمر بھر اس کی صورت نہ بھولے گی۔

"کبھی کبھی ایک آدھ خط تو بھیج دیا کرو۔"

"بھیجوں گا۔"

"مگر میں جواب نہ دوں گی، یہ سمجھ لو۔"

"مت دینا میں مانگتا تو نہیں، مگر یاد رکھنا۔"

گاڑی روانہ ہو گئی اور امرت اس کی طرف تاکتا رہا۔ ایک فرلانگ کے بعد اس نے دیکھا کہ پورنما نے کھڑکی سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا، پھر بچہ کو گود میں لیکر کھڑکی سے ذرا دکھا دیا۔

امرت کا دل اس وقت اڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا، وہ اتنا خوش ہے جیسے اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہو۔

(۴)

اسی سال پورنما کی ماں کا انتقال ہو گیا، پورنما اس وقت زچہ خانے میں تھی۔ ماں کا آخری دیدار نہ کر سکی۔ امرت نے علاج معالجہ میں جتنی دوا دوش ہو سکی کی، کریا کرم کیا برہمنوں کو کھلایا، برادری کی دعوت کی، جیسے اس کی اپنی ماں مر گئی ہو۔ اس کے باپ انتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنے گھر کا مالک تھا کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔

پورنما اب کیس ںا لے سے میکے آتی، اور اسے اب فرصت بھی کہاں تھی، اپنے گھر کی مالکن تھی کبھی یہ گھر چھوڑ کر آتی، اس کے دو تین بچے اور بھی ہوئے، بڑا لڑکا بڑا ہوا اور اسکول میں پڑھنے لگا چھوٹا دیہات کے مدرسہ میں پڑھتا تھا امرت سال میں ایک بار نائی کو بھیج کر خیر سلا منگا لیا کرتا تھا۔ پورنما فارغ البال ہے خوش ہے اس کی تشفی کے لئے اتنا کافی تھا، امرت کے لڑکے بھی اب سیانے ہو گئے تھے۔ خانہ داری کی فکروں میں پریشان رہتا تھا اور عمر بھی چالیس سال سے آگے نکل گئی تھی۔ مگر پورنما کی

یاد ابھی تک اسی کے جگر کے عمیق ترین حصّہ میں محفوظ تھی۔

دفعتاً ایک دن امرت نے سُنا کہ پورنما کے شوہر نے دُنیا عدم کی راہ لی مگر تعجب یہ تھا کہ اسے رنج نہ ہوا۔ وہ خواہ مخواہ اپنے دل میں یہ طے کر بیٹھا کہ اس تجبیث شوہر کے ساتھ پورنما کی زندگی قابل رشک نہیں ہو سکتی۔ فرض کی مجبوری اور عصمت پروری کے لحاظ سے پورنما نے کبھی اپنے سوز جگر کا اظہار نہ کیا، مگر یہ غیر ممکن ہے کہ آرام اور فارغ البالی کے باوجود اسے مکروہ صورت انسان سے کوئی خاص محبّت رہی ہو۔ یہ تو ہندوستان ہی ہے۔ جہاں ایسی اپسرائیں ایسے نااہلوں کے گلے باندھ دی جاتی ہیں، ورنہ کسی دوسرے ملک میں تو پورنما جیسی عورت پر ملک کے نوجوان نثار ہو جاتے اس کی مری ہوئی تمنائیں پھر زندہ ہو گئیں۔ اب اس میں وہ پہلے کی جھجک نہیں ہے۔ اس کی زبان پر نہ وہ مہر خموشی ہے۔ اور پورنما بھی اب آزاد ہے۔ تقاضاسن نے یقیناً اسے زیادہ مہر پرور بنا دیا ہوگا، وہ شوخی اور الھڑپن اور بے نیازی تو کب کی رخصت ہو چکی ہوگی۔ اس دوشیزگی کی جگہ اب آزردہ کار نسائیت ہو گی۔ جو محبّت کی قدر کرتی ہے اور اس کی طلبگار رہتی ہے وہ پورنما کے گھر ماتم پرسی کرنے جائے گا اور اسے اپنے ساتھ لائے گا اور اس کے مکان میں اس کی جو کچھ خدمت ہو سکے گی وہ کرے گا اب اسے پورنما کے محض قرب سے تسکین ہو جائے گی۔ وہ محض اس کے منہ سے یہ سن کر روحانی تشفی پائے گا۔ کہ وہ اب بھی اسے یاد کرتی ہے۔ اب بھی اس سے وہی بچپن کی سی محبّت کرتی ہے۔ بیس سال پہلے اس نے پورنما کی جو صورت دیکھی تھی، وہ بھرا ہوا جسم۔ وہ رخساروں کی سرخی، وہ ملاحت، وہ اس کی کچھی ہوئی ٹھنڈی، جس میں امرت سے بھرا ہوا حوض تھا وہ اس کی نشہ خیز مسکراہٹ وہی صورت بہت خفیف تغیر کے ساتھ ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھی اور وہ تغیر خیل کی آنکھوں میں اب اسے اور بھی خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ ضرور زمانہ کی بیدادیوں کا اس کے اوپر کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔ لیکن پورنما کے جسم میں کسی ایسی تبدیلی کا وہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا

جس سے اس کی دلفریبی میں فرق آجائے۔ اب وہ ظاہر کا اتنا گرویدہ بھی نہ تھا، جتنا اس کی سخن ہائے شیریں کا، اس کی نگاہ محبت کا، اس کے اعتماد کا، وہ مردانہ خود پرستی کے زعم میں شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ پورنما کے ناآسودہ ذوق محبت کو اپنی نازبرداریوں اور گرمجوشیوں سے محفوظ کرے گا اور اپنی پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کر دے گا۔

حسن اتفاق سے ایک دن پورنما خود اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ اپنے گھر آگئی، اس کی ماں ایک بیوہ موسی جو اس کی ماں کے ساتھ ہی اپنی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھی ابھی موجود تھی، وہ سونا گھر آباد ہو گیا۔

امرت نے اس کی بےبسی تواشتیاق سے مخمور ہو کر دوڑا، بچپن اور شباب کی شیریں اور پُر مسرت اور پرشوق یادگاروں کو دل کے دامن میں سنبھالتا ہوا، جیسے کوئی بچہ اپنے ہمجولی کو دیکھ کر اپنے بڑے چھوٹے کھلونے لے کر دوڑے۔

مگر اس کی صورت دیکھتے ہی اس کا اشتیاق اور ولولہ جیسے بجھ گیا، سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ پورنما اس کے سامنے آکر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی، سفید ساڑی کے گھونگھٹ سے آدھا منہ چھپا ہوا تھا، مگر کمر جھک گئی تھی، باہیں سوت سے پتلی، لیشت پا کی رگیں اُبھری ہوئی آنکھوں سے آنسو جاری اور رخسارے زرد، جیسے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی ہو۔

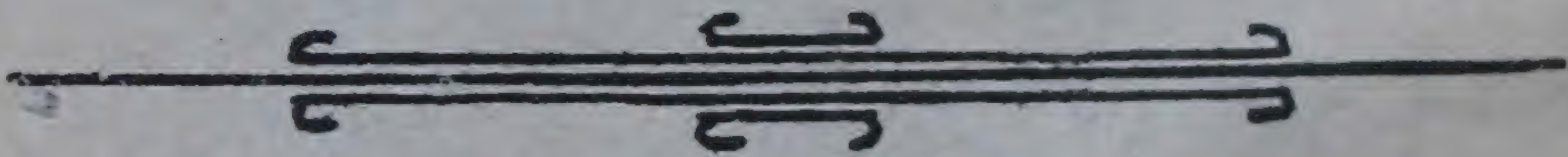
پورنما کی موسی نے آکر کہا، بیٹھو بیٹا، دیکھتے ہو اس کی حالت، سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ بچوں کو بھی آنسو نہیں تھمتے۔ صرف ایک وقت سوکھی روٹیاں کھاتی ہے، اور کسی چیز سے مطلب نہیں۔ نمک چھوڑ دیا ہے، گھی دودھ سب تیاگ دیا، بس روکھی روٹیوں سے کام، اس پر آئے دن برت رکھتی ہے، کبھی ایکادشی، کبھی اتوار، کبھی منگل، زمین پر سوتی ہے، ایک چٹائی بچھا کر، گھڑی رات سے پوجا پاٹ کرنے لگتی ہے، لڑکے سمجھاتے ہیں مگر کسی کی نہیں سنتی، کہتی ہے۔ جب بھگوان نے سہاگ اٹھا لیا سب کچھ متھیا (باطل) ہے

جی بہلانے کے لئے یہاں آئی تھی مگر یہاں بھی رونے کے سوا دوسرا کام نہیں، کہتا سمجھاتی ہوں، بیٹی بھاگ میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہوا۔ اب صبر سے کام لو، بھگوان نے تمہیں بال بچے دیئے ہیں، ان کو پالو، گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ چار کو کھلا کر کھا سکتی ہو، تم من پوتر چاہئیے۔ بدن کو دکھ دینے سے کیا فائدہ مگر سنتی ہی نہیں۔ تم سمجھاؤ تو شاید مانے۔

اور امرت بظاہر بے حس اور باطن میں روح فرسا درد چھپائے کھڑا تھا، گویا جس بنیاد پر زندگی کی عمارت کھڑی تھی وہ ہل گئی ہو۔ آج اسے معلوم ہوا کہ زندگی بھر اس نے جس چیز کو حقیقت سمجھا تھا وہ محض سراب تھا، محض خواب۔ نفس کی اس کامل تسخیر اور عمل کے اس زاہدانہ انہماک میں اس کی وہ پُر ارمان، پُر اشتیاق محبت فنا ہو گئی اور اس کے سامنے یہ نئی حقیقت جلوہ افروز ہوئی کہ دل میں اگر مٹی کو دیوتا بنانے کی قدرت ہے تو انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے۔ پورنما اسی طرح وہ انسان کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کر رہی تھی۔

اس نے احترام کے لہجہ میں کہا، تپسوی کو ہم جیسے غرضی کے بندے کیا سمجھ سکتے ہیں، ہو بھی ہمارا فرض اس کے قدموں پر سر جھکانا ہے۔ سمجھانا نہیں۔

اور پورنما نے منہ پر کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا، تمہارا بچہ تمہیں ابھی تک پوچھا کرتا ہے۔



ڈائل کا قیدی

(۱)

دس بجے رات کا وقت، ایک عالیشان محل میں ایک سجا ہوا کمرہ، صاف شفاف فرش، مسند تکئے، بجلی کی انگیٹھی، بجلی کی روشنی، کرسمس کے ایام ہیں، شرارت کی گرمی بڑھ رہی ہے۔ سیٹھ خوب چند افسروں کی خدمت میں ڈالیاں بھیجنے کا انتظام کر رہے ہیں، پھلوں، میوؤں، کیکوں، مٹھائیوں اور کھلونوں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے سامنے کھڑی ہیں، بغل میں ایک بوڑھے منشی منیم جی افسروں کے نام بولتے جاتے ہیں اور سیٹھ جی اپنے ہاتھوں سے حسب حیثیت ڈالیاں لگاتے جاتے ہیں، چکنی چاند، دوہرا بدن، مند کالر کا کوٹ پہنے ہوئے۔

خوب چند ایک مل کے مالک ہیں اور بمبئی کے بڑے کنٹریکٹر، ایک بار شہر کے

میئر بھی رہ چکے ہیں، اس وقت بھی کئی تجارتی انجمنوں کے سیکرٹری اور صدر ہیں، یہ شہرت، اعزاز و ثروت کس حد تک ڈالیوں کا طفیل ہے، کون جانے، مگر اس تقریب میں ان کے دس پانچ ہزار ضرور بگڑ جاتے ہیں اور سیٹھ نیکی کر دریا میں ڈال والے انسان نہیں ہیں یہاں کے چہرہ سے ان کے کارپرداز صاف جھلک رہی ہے، اگر دُنیا ہنس تو شادی، ڈالی، جی حضوری کہتی ہے تو کہے اور اپنا دل خوش کرے، سیٹھ جی تاجر ہیں، اور تاجر کا کام نفع حاصل کرنا ہے جیسے بھی ملے۔

پجاری نے آکر عرض کی "سرکار بڑی دیر ہو گئی، ٹھاکر جی کا بھوگ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

عام اہل ثروت اصحاب کی طرح سیٹھ جی نے بھی ایک مندر بنوایا تھا، ٹھاکر جی کی پوجا کرنے کے لئے ایک پجاری نوکر رکھ لیا تھا اور روزانہ درشن کیا کرتے تھے، رات کو دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو کر

پجاری کو قہر کی نظروں سے دیکھ کر بولے دیکھتے نہیں کیا ہو رہا ہے۔ یہ بھی ایک کام ہے کھیل نہیں ہے، تمہارے ٹھاکر جی ہی سب کچھ نہ دیں گے، پیٹ بھرنے پر ہی پوجا پاٹ بھی سوجھتی ہے، گھنٹے دو گھنٹے کی دیر ہو جانے سے ٹھاکر جی بھوکوں نہ مر جائیں گے اور نہ ٹھنڈا بھوگ انہیں بدہضمی کرے گا۔

پجاری اپنا سا منہ لے کر چلا گیا اور سیٹھ جی پھر ڈالیاں سجانے میں مصروف ہو گئے۔ ایک ہی منٹ بعد ان کے خاص دوست لالہ کیشو رام تشریف لائے، خوب جلد اٹھ کر اُن کے گلے لپٹ گئے۔ اور پوچھا کدھر سے؟ میں تو ابھی تمہیں بلانے والا تھا۔

کیشو رام نے مسکرا کر کہا۔ ابھی رات تک ڈالیاں لگ رہی ہیں، بھلے آدمی اب تو سمیٹو، کل کا سارا دن پڑا ہے لگا لینا اور ان ڈالیاں سے ہوتا کیا ہے۔ مفت کی

زحمت آج کیا پروگرام ہے۔ یاد ہے؟

خوب چند نے گردن اٹھا کر یاد کرنے کی کوشش کی۔ کیا کوئی خاص پروگرام تھا۔

(یکایک حافظہ بیدار ہو جاتا ہے)

"اچھا وہ بات ہاں یاد آگیا۔ ابھی تو دیر نہیں ہوئی۔"

"تو چلو پھر، میں نے تو سمجھا تھا تم وہاں پہنچ گئے ہوگے۔"

"لیلا ناراض تو نہ ہوگی۔"

"یہ تو وہاں پہونچنے پر معلوم ہوگا۔"

"تم میری طرف سے معذرت کر دینا۔"

(۲)

سیٹھ جی کا سدیشی مل ممتاز ملوں میں ہے۔ جب سے سدیشی تحریک شروع ہوئی ہے۔ مال کی کھپت دونی ہو گئی ہے اور سیٹھ جی نے موقع دیکھ کر قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی آدمیوں کی مزدوری میں تخفیف کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ کیونکہ غلّہ ارزاں ہو گیا ہے اور نصف مزدوری پر کثرت سے آدمی مل رہے ہیں۔ کاشتکار دیہاتوں سے بھاگے ہوئے بمبئی چلے آرہے ہیں، تخفیف کا اعلان محض پرانے آدمیوں کو برطرف کرنے کا حیلہ تھا۔

صبح کا وقت ہے۔ مل کے احاطہ کے باہر مزدوروں کا ہجوم ہے۔ پھاٹک پر کانسٹبلوں کا پہرہ ہے۔ مل میں پوری ہڑتال ہے۔ مزدوروں کے سرغنہ نے سیٹھ جی سے بہت کچھ آرزو منت کی مگر سیٹھ جی نہ دبے۔

اس وقت بھی سرغنہ سیٹھ جی کے پاس آخری شرطیں لے گیا۔ لوگ اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان سا مزدور سائیکل پر دوڑا ہوا احاطہ کے سامنے آیا۔

مزدوروں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا۔ اور سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی یہی لمبا دُبلا، سانولا، نوجوان مزدوروں کا سرغنہ ہے۔

اُس نے مایوسانہ انداز سے کہا "سیٹھ جی بالکل سماعت نہیں کرتے تو پھر ہم کیوں اُن کی خوشامد کریں۔ ہڑتال سے اُن کا کوئی نقصان نہ ہوگا البتہ ہم مر مٹیں گے لیکن ہم خود جان دے کر دوسروں کیلئے راستہ صاف کر دیں گے۔۔۔! ہم خود مریں گے تاکہ دوسرے جئیں دوستو زندگی میں ایسے موقع بھی آتے ہیں جب مر جانا ہی زندگی کی دلیل ہوتی ہے نئے آدمیوں کی بھرتی شروع ہو گئی ہے۔ آج ہمیں عہد کرنا پڑے گا کہ ہم کسی باہر کے آدمی کو مل میں نہ گھسنے دیں گے۔ چاہے ہمارے اوپر لاٹھیاں چلیں، گولیاں ہمیں کھائیں!۔۔۔۔

ایک طرف سے آواز آئی، "سیٹھ جی آگئے" "سیٹھ جی آگئے"۔

سبھی پیچھے پھر پھر کر دیکھنے لگے، چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ کتنے ہی بدحواس ہو کر کانسٹیبلوں سے ملکر اندر جانے کیلئے منت کرنے لگے کچھ لوگ روئی کی گانٹھوں کی آڑ میں جا چھپے جو ذرا دیر پہلے سے آئی تھیں اور مزدوروں کے ہجوم کے باعث اندر جا سکی تھیں۔ صرف مٹھی بھر آدمی سہمے ہوئے نوجوان سرغنہ کے ساتھ ایسے گویا اپنی جان ہتھیلیوں پر لئے ہوئے۔

سیٹھ جی نے کار سے اُترتے ہی کانسٹیبلوں کو حکم دیا "ان بدمعاشوں کو مار کر بھگا دو۔"

فوراً ہڑتالیوں پر ڈنڈے برسنے لگے دس پانچ تو گر پڑے باقی اپنی جانیں لے کر بھاگے گئے تو نوجوان سرغنہ دو آدمیوں کے ساتھ ڈٹا کھڑا تھا۔

ثروت میں اتنا تحمل کہاں سیٹھ جی خود ڈنڈا لے کر دوڑے، کانسٹیبلوں نے ان تینوں آدمیوں کی گردن ناپی، حراست میں لے لیا اور لاری کی طرف لے چلے جو ان لئے لائی گئی تھی۔

ان کا گرفتار ہونا تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کا مجمع چاروں طرف سے آپہونچا اور اُنہیں رہا کرانے کے لئے مصر ہوا کانسٹبلوں نے آدمیوں کے تیور دیکھے تو فراست سے کام لیا انہیں چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے سیٹھ جی نے دانت پیس لئے۔ ایک ہی لمحہ میں صورت حال میں اتنا تغیر ہو جائے گا۔ اس کا اُنہیں گمان نہ تھا اب وہ تنہا ہیں اور ایک ہزار آدمیوں کا مقابلہ صرف ریوالور کا رفیق ہے۔

مجمع نوجوان سرغنہ کی سرکردگی میں سیٹھ جی کی طرف چلا۔ سیٹھ جی کے اوسان خطا ہو گئے۔ موقع و محل کا امتیاز نہ رہا۔ سمجھا یہ سب کے سب مجھے قتل کرنے آرہے ہیں نوجوان کی طرف نشانہ کیا اور ریوالور داغ دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی مزدوروں پر جیسے خون سوار ہو گیا۔ اس کے قبل تک ان میں اہنسا و تشدد، کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ وہ منظم ہو کر سیٹھ جی کو دکھا دینا چاہتے تھے آپ ہماری مزدوری کاٹ کر چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ لیکن اہنسا نے آہنسا کو مشتعل کر دیا۔ سب کے سب قاتلانہ ارادہ سے سیٹھ جی کی طرف لپکے گویا ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پہلا وار کرنے کا اعزاز اسے ملے سیٹھ جی نے دیکھا ہزاروں پر ریوالور سے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتے مگر بھاگ نکلنے کا کہیں راستہ نہ تھا جب کچھ نہ سوجھا تو روئی کی گانٹھوں پر چڑھ گئے اور ریوالور دکھا دکھا کر نیچے والوں کو اوپر چڑھنے سے روکنے لگے۔ نیچے پانچ چھ سو آدمی کا محاصرہ ہے اوپر سیٹھ جی تنہا ریوالور لئے کھڑے ہیں۔ کہیں سے کوئی مدد نہیں آرہی ہے ہر لمحہ زندگی کی اُمید لمحہ میں ڈوبتی جاتی ہے۔ پچھتا رہے ہیں کہ بندوق کیوں نہ لیتا آیا ایک ایک کو بھون کر رکھ دیتا۔ مگر کیا معلوم تھا اس مصیبت کا سامنا ہوگا۔ دفعتاً زخمی نوجوان پیچھے سے آکر سامنے کھڑا ہو گیا اس کے پاؤں میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور خون بہا رہی تھی اس کا چہرہ زرد سے خاکستر ہو گیا تھا اور آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ درد سے بے چین ہے اُسے دیکھتے ہی لوگوں نے اُسے گھیر لیا اُسے بچاتا سیٹھ

جی کو قتل کرنے سے زیادہ اہم تھا۔ اس اہنسا کے جنون میں بھی اپنے سردار کو جیتا جاگتا دیکھ کر ان کے دِل تشکر سے پُر ہوگئے۔ ایک فلک دوز نعرہ بلند ہوا "گوپی کی جے" زخمی گوپی ناتھ نے مجمع کو مخاطب کر کے ضعیف آواز میں کہا میں اب چند لمحوں کا اور مہمان ہوں۔ بھائیو، شاید پھر مجھے نہ دیکھو اس لئے میری تم سے یہ آخری درخواست ہے کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور سیٹھ جی سے مزاحم نہ ہو۔ میرا کہنا مانو اگر سیٹھ جی کا بال بیکا ہوا تو میری آتما کو وہاں بھی چین نہ آئے گا۔

لوگوں نے اعتراض کئے۔ سرگوشیاں کیں، مخالفانہ آوازیں بھی کسیں۔ لیکن گوپی ناتھ کیسے ٹالیں جس نے انہیں کے لئے اپنی زندگی قربان کر دی۔

میدان صاف ہونے لگا، صرف تھوڑے سے جاں نثار باقی رہ گئے تھے تو گوپی ناتھ نے سیٹھ جی سے عاجزی سے کہا۔

"سرکار آپ چلے جائیں۔ میں جانتا ہوں آپ نے گھبراہٹ میں مجھے مارا ہے میں اس وقت بھی آپ سے یہی کہنے جا رہا تھا جواب کہہ رہا ہوں۔ مگر بھگوان کی مرضی۔"

سیٹھ جی کو گوپی ناتھ سے کچھ عقیدت ہو گئی۔ نیچے اُترنے میں کچھ اندیشہ ضرور تھا لیکن اوپر ہی تو جان بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی ادھر ادھر نظروں سے تاکتے ہوئے وہ اُترے اب بھی پچاس ساٹھ آدمی کھڑے ہیں ہر ایک کی آنکھ میں اشتعال ہے کچھ لوگ تخش کلامی کر رہے ہیں۔ مگر کوئی اُن سے بول نہیں سکتا۔ شہید کی تقریر میں یہ اثر ہے۔

سیٹھ جی کار میں بیٹھے اور گوپی ناتھ زمین پر گر پڑا۔ اور پھر نہ اُٹھا۔

(۳)

سیٹھ جی کی کار جتنی تیزی سے چل رہی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے زمین پر گرتے ہوئے گوپی ناتھ کی تصویر بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے دوڑی چلی آتی تھی۔ اگر گوپی اُن کا دشمن تھا تو اس نے اُن کی جان کیوں بچائی اور ایسی حالت میں جب کہ وہ خود مر رہا تھا اس کا اُن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بے گناہ جیسے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اُن کے رُوبرو کھڑا کہہ رہا تھا آپ نے مجھے بے گناہ کیوں مارا؟ نفس کے بندے بالعموم لطیف احساسات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن سیٹھ جی کا ہردا بے حس نہ ہوا تھا کہ ایک بے گناہ کا خون کر کے اُنہیں افسوس نہ ہوتا وہ گھر پہنچے تو ان کے چہرہ پر دہشت چھائی ہوئی تھی۔ مسند پر لیٹ گئے اور ایک لمبی سانس کھینچ کر پرمیلا سے بولے بڑا غضب ہو گیا پرمیلا میں نے ایک بے گناہ کا خون کر دیا، وہی گوپی جو مزدوروں کا سردار تھا معلوم نہیں کیوں مزدوروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں بدحواس ہو گیا اور گوپی پر ریوالور چھوڑ دیا حالانکہ اس غریب نے آخر دم تک مجھے بچانے کی کوشش کی اور اسی کے سمجھانے کا یہ اثر ہے مزدوروں نے مجھے یہاں تک آنے دیا مجھے تو معلوم ہوتا ہے وہ کوئی دیوتا تھا۔ ضرور مر گیا ہوگا۔ حالانکہ زخم پاؤں میں تھا۔ مگر وہ بچے گا نہیں۔ میں کار میں بیٹھا ہوں تو میں نے اسے گرتے دیکھا میں نے اُسے قتل کر دیا۔ مجھے سمجھانے آ رہا تھا۔

سیٹھ جی کا چہرہ سُرخ ہو گیا، آنکھیں مشتعل ہو گئیں، زور زور سے سانس کھینچنے لگے پیشانی پر عرق کے قطرے چھلک پڑے۔ بولے ذرا پنکھا کھول دو۔ پرمیلا گرمی لگ رہی ہے جسم پھنکا جاتا ہے۔ اب مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ میں جا کر پولیس میں اپنے جرم کا اقبال کروں گا۔ میں نے گوپی کو بے گناہ مارا۔ بالکل بے گناہ۔

باہر شور ہو رہا تھا۔ گوپی کے مرتے ہی مزدوروں نے اس کا جلوس نکالا تھا اور سیٹھ جی کے دروازہ پر مظاہرہ کرنے آرہے تھے۔ سیٹھ جی نے شور سُنا اور اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔

پرمیلا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ بھیتر آجاؤ مزدور تمہیں دیکھ لیں گے تو اور بھی طوفان مچائیں گے۔

سیٹھ جی نے ہاتھ چھڑا لیا اور بولے میں چھپنا نہیں چاہتا۔ میں نے ایک بے گناہ کو قتل کیا ہے اور مجھے اس کی سزا ملنی چاہیئے اس لئے جان بچاؤں کہ میں نے دولت جمع کی ہے اور عزت حاصل کی ہے گوپی مجھ سے زیادہ دولتمند تھا۔ مجھ سے زیادہ معزز تھا۔ میں نے اس کا خون کیا ہے دیکھو پولیس مزدوروں کے پیچھے ہے۔ مسلح پولیس، مزدور دروازہ پر آکر ماتم کریں گے شاید میرے دفتر میں آگ لگا دیں۔ لوٹ مچا دیں۔ پولیس اُن پر گولی چلائے گی نہیں میں اپنی جان بچانے کے لئے بے شمار جانیں نہ لوں گا۔ مزدور میرے خون کے پیاسے ہیں مجھے پولیس کے ہاتھوں دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ شاید تم سے پھر ملاقات نہ ہو۔ مجھے معاف کرنا، تمہیں ایشور کو سونپا.......

وہ زینہ کی طرف چلے پرمیلا ان کے پیچھے دوڑی مگر سیٹھ جی نکل گئے اور پرمیلا وہیں کھڑی رہ گئی۔

(۴)

مجرم خود اپنے جرم کا اقبال کر رہا ہو تو وکیل اور بیرسٹر کیا کریں۔ سارا شہر عدالت میں آتا تھا اور سیٹھ جی کا بیان سُن کر دانتوں میں اُنگلی دبا لیتا تھا کچھ لوگ اُن کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے تھے زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں خلل دماغ ہو گیا ہے۔

صفائی کے بیرسٹر نے ہر چند کوشش کی سیٹھ جی سے کہلائیں کہ انہوں نے اپنی مخالفت
جی والوں پر چلایا لیکن سیٹھ جی نے یہ کسی طرح تسلیم نہ کیا۔ ایک ماہر نفسیات نے لکھا
زاہد اور گنہگار دونوں ہی دماغی توازن کے اختلال ہیں جب کوئی مشین بگڑ جاتی
ہے تو وہ بالکل بند ہو جاتی ہے یا سو گنی رفتار سے چلنے لگتی ہے سرسام کا مریض
اس اختلال کی ایک مثال ہے یا تو وہ دیوار پھاند جائے گا یا حرکت بھی نہ کر سکے
گا وغیرہ۔ عدالت کو اب سزا دینے کے سوا چارہ نہ رہا اور سیٹھ جی کو حبس دوام کی
سزا ملی۔

سیٹھ جی کے جاتے ہی تمول اور ثروت کی دیوی بھی رخصت ہو گئی۔ بل تو پہلے
ہی بند ہو چکا تھا۔ لینا دینا چکانے کے بعد معلوم ہوا۔ یہ شان و شکوہ محض طلسم تھا۔
ان طلسموں میں سے ایک جو بڑے بڑے مہاجن آئے دن باندھتے رہتے ہیں جس کی بدولت
وہ ہوا میں محل کھڑا کر دیتے ہیں پانی پر نقش بنا دیتے ہیں ساری دنیا کی آنکھوں میں
سلائی پھیر کر تاریک کو روشن دکھا سکتے ہیں مگر خوب جب یہ طلسم ٹوٹتا۔ تو پھر بھی سلامت
نہ بچا پرمیلا کے پاس اب بھی ہزاروں کے زیور تھے اسی کے گزارہ کے لئے یہ
اثاثہ بھی کافی تھا۔ مگر شوہر کے نام کی لاج تو رکھنی ہی تھی کسی کو انگشت نمائی
کا موقع کیوں ملے۔ اس نے زیور بھی بیچ ڈالے اور سب قرضے چکا دیئے وہ چاہتا
کبھی جب پرماتما نے اس پر اتنا رحم کیا اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا
پوری کر دی تو وہ کیوں نہ خوش معاملہ ہے کیوں نہ سب کچھ پرماتما کے قدموں پر
ہی نثار کر دے ساتویں مہینے جب روز سعید آیا تو پرمیلا ایک چھوٹے سے کرائے
کے مکان میں تھی مگر یہ وہ اپنی کشتی کنارے پہنچا دے گی جس کی نیک نیتی سے
اس نے شوہر کے قرضے ادا کئے اس سے لوگوں کو اس کے ساتھ حسن اعتقاد ہو
گیا تھا کچھ لوگ تو اسے ماہوار وظیفہ دینے پر بھی آمادہ تھے لیکن پرمیلا نے کسی کا

احسان نہ لیا۔ شریف گھرانوں میں اس کی رسائی تھی ہی وہ ان گھروں میں سدا لیشی چیزیں مہیّا کرکے اپنے گذر بسر کو کمالیتی۔ جب تک بچہ دودھ پیتا تھا اُسے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن دودھ چھڑا دینے کے بعد وہ آزاد ہوگئی۔ بچے کو دائی کے سپرد کرکے وہ معاش کی فکر میں نکل جاتی اور دن بھر کی دوادوش کے بعد جب وہ شام کو گھر آتی اور بچے کو گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگتی تو اس کا دل مسرت سے پھول اُٹھتا اور عالم خیال میں وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جاتی اُسے دولت کے لٹ جانے کا ذرا بھر غم نہیں ہے۔ الیشور نے اس کی تلافی کر دی ہے اب اس کی اتنی ہی آرزو ہے کہ سیٹھ جی زندہ و سلامت لوٹ آئیں اور بچے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں، پھر تو اس بے نوائی میں بھی شاکر رہے گی، وہ روز ٹھاکر جی کے قدموں پر سر جھکا کر اپنے شوہر کے لئے دعا مانگتی ہے اُسے یقین ہے کہ الیشور اس پر مہربان ہیں۔ مجبودیت میں اسے صبر اور ہمت اور سکون کا اتھاہ ساگر نظر آتا ہے دعا ہی اب اس کی اُمیدوں کا مرکز ہے۔

(۵)

ایام معصیت اُمید کے سہارے میں کٹ گئے پورے چودہ سال شام کا وقت ہے ہونہار کرشن چند اپنی ماں کے پاس اُداس بیٹھا ہے وہ نہ ماں کو پڑا ہے نہ باپ کو۔

پرمیلا نے اس کی پیشانی پہ پھیلے بالوں کو سُلجھا کر پوچھا۔ کیوں بیٹا تمہارا امتحان تو ختم ہوگیا۔

کرشن چند نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ہاں امتحان تو ہو گیا ہے۔ لیکن میرے پرچے اچھے نہیں ہوئے میری طبیعت پڑھنے میں نہیں لگتی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پرمیلا نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔ یہ تو اچھی بات

نہیں ہے بیٹا مجھے یہ سن کر رنج ہوا ہے۔

کرشن چندر نے قصہ داریانہ نظروں سے دیکھا۔ مجھے بار بار بابوجی کی یاد آتی رہتی ہے۔ اماں وہ تو اب بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ میں سوچا کرتا ہوں وہ آئیں گے تو دل و جان سے ان کی خدمت کروں گا اتنی عظیم الشان قربانی کس کی ہو گی اماں اس پر بھی کچھ لوگ انہیں بے رحم کہتے ہیں میں کئی بار گوپی ناتھ کے گھر گیا ہوں، اماں اُن کی بیوی ہے ماں ہے اور لڑکی ہے جو مجھ سے دو سال بڑی ہے۔ ماں بیٹی دونوں اسی مل میں کام کرتی ہیں دادی بہت بوڑھی ہو گئی ہیں۔ پریملا نے تعجب سے پوچھا تجھے ان کے گھر کا پتہ کیسے لگا۔

کرشن چندر خوش ہو کر بولا۔ میں ایک دن مل میں گیا تھا۔ میں جگہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں مزدوروں نے بابوجی کو گھیر لیا تھا اور وہ جگہ جہاں گوپی ناتھ گولی کھا کر گرا تھا مگر ان جگہوں کا اب وہاں پر نشان تک نہیں ہے۔ عمارتیں بن گئی ہیں مل کا کام زوروں سے چل رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا سب کہتے تھے تم بھیا جی گوپی ناتھ کا روپ بھر کر آئے ہو لوگوں نے وہاں شہید گوپی ناتھ کی تصویر لٹکا رکھی ہے۔ میں اسے دیکھ کر حیرت میں آ گیا جیسے میری تصویر ہو، ہو بہو میری۔ بس بال بھر کا فرق ہے۔ جب میں نے گوپی ناتھ کے گھر والوں کا حال پوچھا تو ایک آدمی دوڑ کر بیوی کو بلا لایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی رونے لگی اور نہ جانے کیوں مجھے رونا آ گیا......

...... عورتیں بڑی تکلیف اٹھا رہی ہیں اماں۔ مجھے ان پر ترس آتا ہے ہم ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتے اماں۔

پریملا ڈری۔ ان جھگڑوں میں پڑ کر تو کہیں پڑھنا نہ چھوڑ بیٹھے۔ بولی ابھی ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں بیٹا دولت ہوتی تو کہتی دس پانچ روپے دے دیا کرو لیکن گھر کا حال تو تم جانتے ہی ہو۔ ابھی جی لگا کر پڑھو، جب تمہارے بابوجی آ جائیں

تب شاید ہمارے اچھے دن آجائیں۔

اس وقت کرشن چندر خاموش ہو گیا۔ لیکن آج سے اس کا یہ معمول ہو گیا کہ اسکول سے لوٹ کر ایک بار گوپی ناتھ کے مزور جاتا پرمیلا اُسے جب خرچ کے لئے جو پیسے دیتی اُن سے ان بے کسوں کی مدد کرتا۔ کبھی پھل لے لئے کبھی سبزی لے لی، کبھی کچھ۔

ایک دن کرشن کو گھر آنے میں دیر ہوئی تو پرمیلا بہت گھبرائی۔ پوچھتی پاچھتی گوپی کے گھر پہونچی تو دیکھا۔ ایک تنگ گلی میں ایک بوسیدہ میلے متعفن گھر کے اندر گوپی ناتھ کی بیوہ ایک ٹوٹی کھاٹ پر پڑی ہوئی ہے اور کرشن چندر کھڑا اُسے پنکھا جھل رہا ہے۔ بولی آج تم یہاں کب تک رہو گے بیٹا۔ دیا بتی کا وقت آگیا۔ چلو اب دیر نہ کرو۔

کرشن چندر کو اس کا آنا ناگوار ہوا بولا۔ میں ابھی نہ جاؤں گا۔ اماں دیکھو کلی کتنی بیمار ہے۔ دادی کو کچھ سوجھتا نہیں بچی کھانا بنا رہی ہے ماں کے پاس کون بیٹھے۔

"لیکن یہاں پھر بھی تین آدمی ہیں میں تو اکیلی ہوں اس وقت چلو، سویرے آجانا۔"

مرلیتہ نے پرمیلا کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں اور نحیف آواز میں بولی۔ "آؤ ماتاجی، بیٹھو میں تو بھیا سے کہہ رہی تھی۔ دیر ہو رہی ہے اب گھر جاؤ مگر یہ سنتے ہی نہیں۔ مجھ ابھاگن پر نہ جانے کیوں اتنی دیا آتی ہے۔"

مکان میں دم گھٹ رہا تھا ہوا کا کہیں گذر نہیں۔ لیکن کرشن چندر ایسا خوش تھا گویا کوئی پردیسی چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر اپنے گھر آگیا ہو۔

پرمیلا نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک دیوار پر اُسے ایک تصویر نظر آئی اس نے قریب جا کر تصویر دیکھی تو اس کا سینہ دھک سے ہو گیا بیٹے کی طرف

دیکھ کر بولی۔

"تو نے یہ تصویر کب کھنچوائی تھی۔ کرشنا نے مجھ سے کہا بھی نہیں۔"

کرشن مسکرا کر بولا۔ "یہ میری تصویر نہیں ہے اماں گوپی ناتھ کی تصویر ہے۔"

پرمیلا کو یقین نہ آیا۔ چل جھوٹا کہیں کا۔

مرلیکھ نے حسرت ناک لہجہ میں کہا "بھیا ٹھیک کہتے ہیں، ماتا جی میرے آدمی ہی کی تصویر ہے۔ بھگوان کی لیلا کوئی نہیں جانتا۔ مگر بھیا کی صورت ان سے ملتی ہے کہ مجھے اچنبھ ہوتا ہے اور سبھاؤ بالکل وہی تھے۔

پرمیلا پر ایک نامعلوم دہشت کا غلبہ ہوا۔ جیسے اس نے کوئی بُرا خواب دیکھا ہو اس نے کوئی جواب نہ دیا کرشن چند کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی دروازہ کی طرف چل گویا کوئی اُسے اُس کے ہاتھوں سے چھیننے لئے جاتا ہو۔

مرلیکھ نے صرف اتنا کہا ماتا جی کبھی انہیں پاس آنے دیا کرو نہیں تو میں مر جاؤں گی۔

پندرہ سال کے بعد سیٹھ خوب چند اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے پر ابطر درخت ٹھونٹھ ہو کر رہ گیا تھا۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں، سر کے بال سن، ڈاڑھی جنگل کی طرح بڑھی ہوئی۔ دانت گویا انہیں کھو گئے۔ کمر کمان۔ ٹھونٹھ دیکھ کر کون پہچان سکتا ہے یہ وہی تناور درخت ہے جس کی گھنی ٹہنیوں میں چڑیاں بسیرا کر لیتی ہیں۔

اسٹیشن کے باہر نکل کر وہ سوچنے لگے۔ کہاں جائیں، اپنا نام لیتے شرم آتی تھی۔ پرمیلا ابھی زندہ ہے۔ عاقبت کے بورئیے بٹورنے کے لئے کس سے پوچھیں پرمیلا جیتی ہے یا مر گئی ہے اگر ہے تو کہاں ہے انہیں دیکھ کر خوش ہوگی یا منہ پھیر لے گی۔

خوب چند کی کوٹھی ابھی تک خوب چند کی کوٹھی کہلاتی تھی۔ زبان خلق قانون

کے الٹ پھیر کیا جانے۔ اپنی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر انہوں نے ایک پان والے سے پوچھا کیوں بھیا یہی تو خوب چند سیٹھ کی کوٹھی ہے؟

پان والے نے تاسبدہانہ انداز سے پان لگاتے ہوئے کہا۔ سیٹھ خوب چند کی جب تھی تب تھی۔ اب تو للّلہ لیلاز ح کی ہے۔

"اچھا مجھے یہاں آئے بہت دن ہو گئے، سیٹھ جی کے یہاں نوکر تھا۔ سُنا سیٹھ جی کو کالا پانی ہو گیا تھا"

ہاں بچارہ عمل سانسی میں مارا گیا۔ چاہتے تو لے دلاغ بچ جاتے۔ مگر نیب سالا گھر مٹی میں مل گیا۔

"سیٹھانی تو ابھی ہوں گی"

"ہاں سیٹھانی کہیں نہیں ہیں۔ سیٹھ جی کا ایک لڑکا بھی ہے"

سیٹھ جی کے چہرہ پر جوانی ناچ اُٹھی، زندگی کا وہ جوش اور دلولہ جو آج پندرہ سال سے کتبھ کرن کی طرح پڑا سو رہا تھا۔ گویا نئی زندگی پا کر اٹھ بیٹھا ہے اور اس وقت تو وہ استخوان میں سما نہیں رہا ہے۔

انہوں نے اس بے تکلفی سے پان والے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گویا پرانی دوستی ہے۔ اور پوچھا اچھا ان کے لڑکا بھی ہے کہاں رہتی ہیں۔ سیٹھانی ذرا بتا تو دو جا کر سلام کر آؤں بہت دنوں ان کا نمک کھایا ہے۔

تنبولی نے پرمیلا کے مکان کا پتہ دیا وہ اسی محلہ میں رہتی تھی۔ سیٹھ جی گویا آسمان میں اُڑتے ہوئے یہاں سے چلے پرمیلا کے گھر کی طرف۔

راستے میں ٹھاکر جی کا مندر نظر آیا سیٹھ جی نے مندر میں جا کر مورتی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اُن کے ساتھ ایک ایک رونئیں سے عقیدت اور استحسان کے نغمے سے نکل رہے تھے۔ اس طولانی کوفت اور یاس کے عالم میں ان کی مجروح اور مجبور آتما

کو اگر عافیت ملتی تھی تو وہ یہی عبادت اور حب سلائی تھی۔ دن بھر ایک کے کوٹھوں میں جتے رہتے یا چاولوں کے چلانے کے بعد جب وہ رات کو زمین کی آغوش میں سوتے تو اُن کی رُوح کی گہرائیوں سے درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی صدا نکلتی تھی "ایشور! مجھ پر رحم کرو" جب ان کے پاس ثروت تھی عیش کے سامان تھے، جوانی تھی اختیار تھا۔ اُنہیں عبادت کے لئے موقع نہ ملتا تھا دل، سیاہی کی طرف لپکتا تھا اب محروم اور پامال ہو کر انہیں خدا کے سوا اور کہیں سایہ نہیں ملتا تھا۔ پانی پر جب تک کائی کا پردہ ہے اس میں روشنی کا گزر کہاں۔

سیٹھ جی مندر سے نکلے ہی تھے کہ ایک عورت نے مندر میں قدم رکھا۔ خوب چند کا دل اُچھل پڑا خون کا ایک ایک قطرہ ناچ اُٹھا وہ ایک از خود رفتگی کی حالت میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئے معلوم ہوا دل کی حسرت آنکھوں سے باہر نکل پڑی ہے۔ یہ پرمیلا تھی۔

ان پندرہ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب انہیں پرمیلا کی یاد نہ آئی ہو وہ حسن اور شباب کی تصویر ان کی نظروں کے سامنے رہتی تھی۔ آج اس تصویر اور حقیقت میں کتنا فرق نظر آیا۔ تصویر زمانہ کے اثرات سے مامون تھی۔ اس پر دُکھ سُکھ کا کوئی نشان نہ تھا وہی شرمیلی نگاہیں تھیں وہی دلفریب تبسم۔ اس حقیقت میں انہیں عامل کامل جلال نظر آیا۔ اور اُن کا دل عقیدت میں ڈوبے ہوئے ترنم کی طرح تھرا تھرا اُٹھا۔ ایک ولولہ سا اُٹھا کہ اس کے قدموں میں گر پڑوں اور کہوں اس بدنصیب کو اپنے آنچل میں پناہ دو مگر اس ہیبت کدائی جو اس کے رو برو جاتے انہیں شرم دامنگیر ہوئی۔

پرمیلا نے ٹھاکر جی کی پوجا کر کے تلسی جل لیا اور مندر کے باہر نکلی خوب چند بھی اس کے پیچھے چلے کچھ دور آگے چل کر ایک نیچ منزل کا چال ملا پرمیلا چال

پھاٹک میں داخل ہوئی۔ سیٹھ بھی اندر گھسے۔ مگر وہ تو ایک پوری بستی تھی۔ یہ سلسلہ کدھر گئی۔ کیا خیر، دفعتاً ایک نوعمر لڑکے کو اندر سے نکلتے دیکھ کر وہ پکار اُٹھے ذرا سنو تو بیٹا تم سے کچھ پوچھنا ہے۔

لڑکا آہستہ سے ان کی طرف آیا۔ ایک لمحہ غائر نظروں سے ان کی طرف دیکھا پھر چشم پُرآب ہو کر اُن کے قدموں سے لپٹ گیا۔ سیٹھ جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا یہ تو گوپی ہے۔ صرف عمر میں کچھ کم۔ وہی صورت، وہی قد و قامت، وہی خد و خال وہ عالم بالا سے اُتر آیا۔ اور تازہ جوان ہو کر انہیں رعشہ سا آ گیا۔ ہیبت اُن کے سامنے مجسم کھڑی تھی۔

کرشن چندر نے ایک لمحہ میں اُٹھ کر کہا۔ ہم کئی دن سے آپ کا انتظار کر رہے تھے آئیے اندر آئیے۔ میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ کہیں بھی دیکھ کر پہچان جاتا۔

خوب چند اس کے ساتھ اندر چلے تو مگر اِن کا دل جیسے خیالات کے بھنور میں پڑا ہوا تھا۔ گوپی کی صورت کیا کبھی ذہن سے اتر سکتی تھی اس کے چہرہ کو انہوں نے کتنی ہی بار خواب میں دیکھا تھا۔ وہ سانحہ اُن کی زندگی کا سب سے یادگاری واقعہ تھا۔ گوپی کی وہ صورت بھی ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔

کرشن چندر زینے کے پاس رُک کر بولا۔ جا کر اماں سے کہہ آؤں آپ کے لئے نئے نئے کپڑے بنے رکھے ہیں۔

خوب چند نے لڑکے کو گود میں لے کر اس طرح کا بوسہ لیا۔ جیسے وہ بچہ ہو اور اُسے گود میں لئے ہوئے زینے پر چڑھے اور بے تکان چڑھتے چلے گئے۔

۷

آج سیٹھ جی کو آئے ساتواں دن ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ سیٹھ جی سندھیا کرنے جا رہے ہیں کہ گوپی ناتھ کی پتنی نے آکر پرمیلا سے کہا ماتا جی اماں کا جی اچھا نہیں ہے۔ بھیا کو بلا رہی ہیں۔ پرمیلا نے کہا۔

"آج وہ نہ آسکیگا۔ اس کے پتا جی آگئے ہیں اُن سے باتیں کر رہا ہے۔"

کرشن چندر نے کمرے سے اُن کی باتیں سن لیں۔ فوراً برآمدہ میں آکر بولا نہیں اماں میں دادا سے پوچھ کر ذرا دیر کے لئے چلا جاؤں گا۔

پرمیلا نے خفا ہو کر کہا۔ تو وہاں جاتا ہے تو تجھے گھر کی سدھ نہیں رہتی۔ نہ جانے ان سبھوں نے تجھے کیا بوٹی سنگھا دی ہے۔

"میں بہت جلد چلا آؤں گا ماں تمہارے پیروں پڑتا ہوں۔"

"تو بھی عجیب لڑکا ہے وہ بچارے اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں اور تجھے وہاں جانے کی پڑی ہے۔ سیٹھ جی نے یہ باتیں سنیں آکر بولے۔ کیا ہرج ہے جلدی آنے کو کہہ رہے ہیں تو جانے دو۔ کرشن چندر خوش ہو کر بہن کے ساتھ چلا گیا...... پرمیلا بولی جب سے میں نے گوپی کی تصویر دیکھی ہے۔ مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ کہ بھگوان مجھ کیا کرنے والے ہیں۔ لیکن یہی معلوم ہوتا ہے کہ بس اس کی تصویر ہے۔ سیٹھ جی نے بھی تشویش ظاہر کی۔ میں تو پہلی بار اُسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ معلوم ہوا گوپی ناتھ ہی کھڑا ہے۔

"گوپی ناتھ کی گھر والی کہتی ہے کہ اس کی چال ڈھال بھی گوپی جیسی ہے۔ بھگوان کی لیلا ہے۔ کہ جس کی میں نے جان لی وہ میرے بیٹے کے روپ میں جنم لے۔"

دو گھنٹے گزر گئے اور کرشن چندر گھر نہیں آیا۔ ماں بیتاب ہونے لگی سیٹھ جی کو بھی تشویش ہوئی۔ کیا کرنے گا۔ اس کی عادت ہے گوپی کے گھر جاتا ہے تو اسے کھانے پینے تک کی سدھ نہیں رہتی۔

دوپہر ہوا شہر میں خبریں اُڑنے لگیں کہ مل میں ہڑتال ہو گئی پولیس بلا لی گئی ہے دوڑی جلدی سے یہ خبر پریملا وحشت سے لرزنے لگی بار بار کھڑکی سے دیکھتی۔ ابھی تک نہیں آیا۔ کہیں ہڑتالیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔

اچھا یہ مجمع کیسا چلا آ رہا ہے اسی طرف آتا ہے کوئی ایک ہزار آدمی ہوں گے کوئی ارتھی معلوم ہوتی ہے ارتھی ہے۔ سیٹھ جی بھی جھانکنے لگے۔ مزدور کوئی شمار نہیں مر گیا ہے وہ جلوس پریملا کے مکان کے نیچے رُک گیا اور آواز آئی "شہید کرشن زندہ باد"

پریملا کا خون جیسے خشک ہو گیا وہ مدہوشی کے عالم میں زینے کی طرف دوڑی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

سیٹھ جی نے بھی یہ نعرہ سُنا مگر اُن کی پیشانی پر بل تک نہ آیا بڑا اطمینان تو کل صبر اور سکون کے ساتھ نیچے آئے۔ لاش کو گلے سے لگا لیا اس کا بوسہ لیا۔ دریافت کیا۔ معلوم ہوا مل میں آج ہڑتال تھی منیجر نے حاضری کے متعلق کچھ نئے قاعدے کا فقرہ سکے تھے مزدوروں نے اُسے منظور نہ کیا۔ مل میں ہڑتال ہوئی۔ کرشن چندر کو مزدوروں نے اپنا سرغنہ بنا لیا۔ اس کی کم عمری کے باوجود مزدوروں کو اس پر کامل اعتماد تھا۔ ان کو یقین تھا کہ یہ گوپی کا اوتار ہے گوپی کی بیوی نے اس معاملہ میں مشورہ کرنے کے لئے آج کرشنا کو بلایا تھا کرشنا مزدوروں کا نمائندہ بن کر آدمیوں کے ساتھ پولیس کی مزاحمت کے باوجود منیجر سے ملنے جا رہا تھا ہنگامہ ہو گیا پولیس نے گولیاں چلائیں اور کرشن چندر ان کی بندوق کا نشانہ بن گیا۔ سیٹھ جی اُسی اطمینان کے ساتھ

گئے اور پرمیلا کو سنبھال کر نیچے لائے پرمیلا بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی اور بین کرنے لگی رونے لگی کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسو نہ نکل رہے ہوں۔

کئی منٹ گزر گئے۔ پرمیلا لاش کو سینے سے لگائے روتی رہی جس نعمت کو پا کر اس نے مصیبت کو راحت سمجھا تھا اُس سے آج وہ محروم ہو گئی یاس کی تاریکی میں جس شمع سے اُمید اور صبر کی روشنی پا رہی تھی وہ شمع بجھ گئی۔

سیٹھ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کیا کرتی ہو پرمیلا جس کی موت پر ایشور کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اس کی موت پر روتی ہو۔ ظلم کے سامنے سینہ سپر ہو جانے سے بہتر موت کس کو نصیب ہوتی ہے۔

پرمیلا نے دہشت زدہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی تم سمجھتے ہو گے کہ ایشور جو کچھ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ میں ایسا نہیں سمجھتی۔ کیوں سمجھوں ہائے میرا لال۔ میرا لعل۔ میرا سورج۔ میرا چاند۔ میری زندگی کے سہارے تجھے کھو کر کیسے صبر کروں جسے گود میں دیکھ کر نہال ہو گئی تھی۔ اُسے زمین پر پڑا دیکھ کر دل کو کیسے سنبھالوں۔

اُسی رات کو وہ غم نصیب ماں دُنیا سے رُخصت ہو گئی۔ چڑیا اپنے بچے کی تلاش میں پنجرے سے نکل گئی۔ اور سیٹھ خوب چند آج بھی مزدوروں کے محال میں ان کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔